یہ کتاب اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ
سکریٹریٹ، حکومت بہار کے اشاعتی امداد منصوبہ
کے تحت موصول رقم سے شائع ہوئی ہے۔

رانگ نمبر

(افسانے)

نشاط پروین

ثالث پبلیکیشنز، مونگیر

© جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ

Wrong Number
by : Nishat Parween
Year of Edition : 2024
Price : 250/-

نام کتاب: رانگ نمبر
مصنفہ : نشاط پروین
رابطہ : 8210489478
سال اشاعت : ۲۰۲۴ء
قیمت : ۲۵۰ روپے
صفحات : ۱۴۴
تعداد : ۵۰۰
تزئین وسرورق : اعجاز رحمانی
مطبع : صائمہ پبلیکیشنز، سبزی باغ، پٹنہ

ملنے کے پتے:
۱۔ بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ
۲۔ صائمہ پبلیکیشنز، سبزی باغ، پٹنہ
۳۔ نشاط پروین، شاہ کالونی شاہ زبیر روڈ، مونگیر

Published by:
SALIS PUBLICATIONS
Shah Colony, Shah Zubair Road, Munger 811201

انتساب

والدین
اوراساتذہ کے نام

یہاں کسی کو کوئی راستہ نہیں دیتا
مجھے گرا کے اگر تم سنبھل سکو تو چلو

ندافاضلی

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	اپنی بات	۸
	حرف اعجاز	۱۱
۱	رانگ نمبر	۱۸
۲	بڑے گھر کی بہو	۲۲
۳	کیا بھروسہ ہے زندگانی کا	۳۱
۴	خوبصورت بلا	۳۶
۵	شمن چچی کا گھر	۴۱
۶	بیتے ہوئے دن	۴۴
۷	شبانہ	۴۹
۸	کرچیاں	۵۳
۹	ماں	۵۶
۱۰	پیار	۶۰
۱۱	نئے راستوں کی تلاش	۶۴
۱۲	ہم سفر	۶۸
۱۳	شور	۷۳
۱۴	جھوٹا سچ	۷۷
۱۵	کوئلہ بھئی نہ راکھ	۸۲

۱۶	یقین	۸۸
۱۷	زخم زندگی	۹۱
۱۸	فیس بک کا سائیڈ ائفکٹ	۹۴
۱۹	رواج	۹۷
۲۰	نادانی	۱۰۰
۲۱	بدلہ	۱۰۳
۲۲	بیٹی	۱۰۸
۲۳	چودھویں کا چاند	۱۱۰
۲۴	دو دوست	۱۱۴
۲۵	موبائل کی لت	۱۱۷
۲۶	ساون کی یادیں	۱۱۹
۲۷	شہزادی	۱۲۲
۲۸	اسٹیٹس	۱۲۶
۲۹	واپسی	۱۳۰
۳۰	نئی روشنی	۱۳۴
۳۱	سہیلی	۱۳۷
۳۲	چٹک مٹک	۱۴۱

اپنی بات

کوئی بھی ایسی بات ہوتی جو مجھے اچھی نہ لگتی اسے میں لکھ لیتی۔ لکھتے لکھتے ایک دن اس نے کہانی کا روپ لے لیا۔ اسے میرے ابی نے پڑھ لیا اور انہوں نے کہا تم نے افسانہ ہی بنا ڈالا۔ ارے! زندگی میں بہت سارے موڑ آتے ہیں ان سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ سبھی کو فیس کرنا ہے۔ وہ مجھے سمجھاتے۔ طرح طرح کی باتیں بتاتے ،مثالیں پیش کرتے لیکن مجھے لگتا کہ میرے ساتھ بہت غلط ہوا ہے۔ پھر میں ڈر گئی۔ مجھے لگنے لگا کہ میرے دل کی باتیں سب جان جائیں گے۔ اس لیے میں چپ ہوگئی۔ لکھنا بھی بند کر دیا۔ اب میں صرف ہنستی اور مسکراتی رہتی کہ دل کا درد لوگ پڑھ نہ لیں۔ خیر! یہ تو بہت پرانی یادیں ہیں۔ ان دنوں راتیں اندھیری اور کالی ہوا کرتی تھیں۔

پھر ایک نئی صبح کا آغاز ہوا۔ زندگی نے ایک نیا موڑ لیا اور اب میں ایک ایسے انسان کے ہم راہ تھی جس کی دنیا میں وہ سب کچھ تھا جس کی مجھے ہمیشہ سے تمنا رہی تھی۔ جیسی زندگی میں چاہتی تھی وہ مجھے ملی گئی تھی۔ اب مجھے ادبی ماحول میسر آ گیا تھا۔ ادب کے لوگ ،ادب کی باتیں اور شعر و شاعری۔ یہ سب مجھے بہت اچھا لگتا۔ مجھے میگزین پڑھنے میں دل کبھی نہ لگتا۔ میری عمر کی ساری لڑکیاں اور میری سہیلیاں ''پاکیزہ آنچل'' کی دیوانی تھیں لیکن میں یہ سب نہیں پڑھ پاتی تھی۔ ہاں میں ریڈیو بچپن سے سنتی آ رہی ہوں۔ آکاشوانی پٹنہ سے اردو پروگرام ہوتا۔ میں اسے سنتی۔ ریڈیو پر اور بھی کئی طرح کے پروگرام ہوتے جیسے مشاعرہ وغیرہ۔ میں سب سنتی اور اپنے تاثرات لکھ کر بھیجتی۔ لیکن ہمارے گاؤں کا وہ ماحول نہیں تھا کہ میں ریڈیو اسٹیشن جاتی۔ اتنی آزادی نہیں تھی۔ لہٰذا اس جانب کبھی دھیان ہی نہیں گیا۔ سو خاموشی اختیار کر چکی تھی مجھے سننے اور سنانے کا شوق تھا۔ میری

باتیں دلچسپ ہوا کرتی ہیں.....ایسا لوگ کہتے ہیں۔ میری پرورش مشترکہ خاندان میں ہوئی تھی۔ وہاں سننے سنانے والے کئی لوگ موجود تھے۔ لیکن شادی کے بعد جب میں مونگیر آئی تو گھر میں میرے شوہر کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ چنانچہ میں اپنی باتیں انہیں ہی سنانے لگی۔ اپنے گاؤں اور گھر کے چھوٹے بڑے قصے، وہاں کے لوگوں کی کہانیاں، رشتے داروں کی باتیں وغیرہ وغیرہ۔ کچھ دنوں تک تو وہ میری باتیں سنتے رہے پھر ایک دن کہنے لگے کہ آپ افسانے لکھئے۔ افسانہ کا نام سن کر میں ڈر گئی۔ اور پھر چپ رہنے لگی۔ لیکن عادت سے مجبور تھی لہٰذا پھر ان کی سامع خراشی کرنے لگی۔ لیکن مجھے لگتا کہ میری باتیں سنتے سنتے اب وہ ''پک'' گئے ہیں اور مزید میری باتیں سننا نہیں چاہتے۔ اور اسی لیے وہ مجھے افسانے لکھنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ میں جب بھی کوئی قصہ شروع کرتی وہ کہتے کہ اسے لکھ لیجئے۔ لیکن میں قلم اُٹھانے سے قاصر تھی اس لیے خاموش ہو رہی۔

ایک بار اتفاق ایسا ہوا میری پھوپھی بہت بیمار ہو گئیں اور میں انہیں دیکھنے پٹنہ نہ جا سکی۔ گرچہ مونگیر سے پٹنہ کی دوری کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن میرے شوہر نامدار کے پاس چھٹیاں نہیں بچی تھیں۔ پھر جب دسہرہ کی چھٹی ہوئی تو وہ مجھے لے کر پٹنہ آئے۔ یہاں میں اپنی پھوپھی سے ملی۔ انہیں بھی میری طرح باتیں کرنے کا شوق تھا اور وہ بھی طرح طرح کے سچے قصے سناتی رہتی تھیں۔ ہم دونوں کے درمیاں خوب باتیں ہوئیں۔ اب وہ ٹھیک ہو چلی تھیں۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ چراغِ سحری ہیں۔ کہتے ہیں کہ چراغ بجھنے سے پہلے پھڑ پھڑاتا ہے۔ ایک روز شام کے وقت میں ان سے مل کر آئی اور آدھے گھنٹے کے بعد خبر آئی کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ سن کر صدمے سے میرا برا حال ہو گیا اور میں سوچنے لگی کہ کیا اللہ کی مصلحت تھی؟ کیا صرف مجھ سے ملاقات کرنے کے لیے اللہ نے انہیں زندہ رکھا تھا؟ خیر اللہ کی باتیں اللہ ہی جانے۔ پھوپھی کا میکہ اور سسرال سب اسی گاؤں میں تھا۔ بچپن سے میرا لگاؤ ان کی جانب تھا۔

ان کے انتقال نے عجیب حالت کر دی اور پھر میں نے اپنے قلم کو جنبش دی اور اس طرح میں نے اپنی زندگی کا پہلا افسانہ لکھا جس کا عنوان تھا ''سنّاٹا'' بعد میں اس کا عنوان بدل کر ''کیا بھروسہ ہے زندگانی کا'' کر دیا۔ یہ افسانہ میں نے آکاشوانی بھاگلپور کے اردو پروگرام میں پیش کیا اور اسے وگوں نے پسند فرمایا۔

آج سے لگ بھگ پچاس سال قبل پروفیسر مہدی علی، پروفیسر جابر حسین، مولانا منت اللہ رحمانی اور ڈاکٹر تسنیم احمد صدیقی وغیرہ نے مل کر مونگیر میں ''اردو فورم'' نام کا ایک ادارہ قائم کیا جس کا مقصد اردو زبان وادب کی ترویج وترقی تھا۔ یہ فورم آج بھی قائم ہے اور اسی شان کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس فورم میں صرف منتخب لوگوں کو ہی ممبر بنایا جاتا ہے۔ میرے شوہر پروفیسر اقبال حسن آزاد اس کے بہت پرانے ممبر ہیں۔ جب میرا افسانہ ''کیا بھروسہ ہے زندگانی کا'' شایع ہوا تو اس وقت ڈاکٹر سہیل اس کے کنوینر تھے۔ انہوں نے جب وہ افسانہ پڑھا تو اس سے کافی متاثر ہوئے اور مجھے اردو فورم کا رکن بننے کی دعوت دی اور اس طرح میں اس باوقار فورم کی ممبر بن گئی۔ اردو فورم کی نشست ہر ماہ باری باری سے کسی ایک ممبر کے یہاں ہوتی ہے۔ اردو فورم کی ممبر بننے کے بعد میں نے باضابطہ افسانہ نگاری شروع کی اور تقریباً ہر ماہ ایک افسانہ لکھ لیتی ہوں۔ اب تک میں نے جتنے بھی افسانے لکھے ہیں انہیں قارئین کے سامنے پیش کرنے میں مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے۔

آخر میں میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جنہوں نے قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی اور اس مجموعے کی اشاعت میں میری مدد فرمائی۔ پروفیسر اقبال حسن آزاد، پروفیسر صفدر امام قادری، پروفیسر منظر اعجاز (مرحوم) اور اردو فورم کے تمام اراکین میرے شکریے کے مستحق ہیں۔

◀◀ ● ▶▶

نشاط پروین

حرفِ اعجاز

نشاط پروین ان دنوں بحیثیت افسانہ نگار اپنا شناس نامہ مرتب کرنے میں مصروف ہیں حالانکہ افسانہ نگاری کے علاوہ مضمون نگاری سے بھی ان کی خاصی دلچسپی ہے۔ میں نے مونگیر سے پٹنہ تک ادبی نشستوں، کانفرنسوں اور سیمیناروں میں بحیثیت مقالہ خواں بھی دیکھا اور سنا ہے۔ ممکن ہے آگے چل کر ان کے مزاج و مذاق میں کچھ اور تبدیلیاں رونما ہوں۔ لیکن وہ فی الحال میری نگاہ میں بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ بحیثیت افسانہ نگار ہی ان کا روشناسِ حلقۂ ادب ہونا زیادہ مناسب ہے۔

نشاط پروین کا عرصۂ کار بحیثیت افسانہ نگار ہر چند کہ طویل نہیں ہے لیکن چند برسوں ہی میں انہوں نے جتنے افسانے تخلیق کیے ہیں اور جیسے افسانے تخلیق کیے ہیں وہ قابلِ توجہ بھی ہیں اور لائقِ اعتنا بھی۔ میرے پیشِ نظر ابھی ان کے مجموعۂ افسانہ کا جو مسودہ ہے، وہ ڈیڑھ درجن افسانوں پر مشتمل ہے۔ افسانے کچھ اور بھی ہیں جو یہاں وہاں بکھرے پڑے ہیں اور جن کی تلاش جاری ہے۔ وہ تادمِ تحریر ایم۔اے۔ اردو کی طالبہ ہیں اور فی الحال اس طرف ان کی توجہ زیادہ رہتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ درست بھی ہے۔ علاوہ ازیں گھر اور خانہ داری کی بھی ذمہ داریاں ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بہر حال وہ ایک گھریلو خاتون ہیں۔ افسانہ نگاری تو فاضل وقتوں کا ایک مشغلہ ہے جو اُن کے ذوق و شوق سے ہم آہنگ ہے۔

نشاط پروین کے افسانے موضوعاتی اعتبار سے قدرے تنوعات کے حامل ہیں۔ ان میں رنگارنگی اور بوقلمونی کی جھلک بھی واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ وہ گھر آنگن کی کہانیاں بھی

بُنتی ہیں، معاشرے اور معاشرے کے احوال و کوائف پر بھی نظر رکھتی ہیں اور جن واقعات و واردات کو انفرادی اور اجتماعی شعور کا حصہ بنانا چاہتی ہیں، انہیں نہایت ہی سنجیدگی، شائستگی اور اسلوب کی شگفتگی کے ساتھ بیانئے میں ڈال کر جامع اور مربوط پلاٹ تیار کر دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ واقعات و واردات کی پیوندکاری ہی سے ماجرا نگاری یا پلاٹ سازی کا کارنامہ انجام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن لنگر مار دینے سے یہ ڈھیلا ڈھالا رہ جاتا ہے۔ اس کا احساس و ادراک نشاط پروین کو بدرجۂ اتم ہے۔ وہ بخیہ گری کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتی ہیں اور ایسی ہنرمندی اور فنکاری و ہوشیاری سے یہ کارنامہ انجام دیتی ہیں کہ بخیئے کے آثار و آیات بھی معدوم ہو جاتے ہیں۔

افسانہ نگار تو جانتا ہی ہے لیکن افسانے کا قاری بھی عام طور پر یہ بات جانتا ہے کہ واقعات و واردات جو ماجرا نگاری یا پلاٹ سازی میں بروئے کار لائے جاتے ہیں، وہ کرداروں کے تفاعل سے رونما ہوتے ہیں۔ اس سے کرداروں کی اہمیت بنیادی حیثیت کی حامل ہو جاتی ہے لیکن افسانہ نگار اپنے ذوق و وجدان کے مطابق کرداروں کی زائیدگی اور پروردگی نیز ان کی آرائش و زیبائش پر صرفۂ موقلم سے وہ وہ نسخے استعمال کرتے ہیں کہ اس کا فطری حسن زائل ہو جاتا ہے اور وہ ایک مصنوعی پیکر سا دکھائی دینے لگتا ہے۔ نشاط پروین اپنے کرداروں کے فطری حسن کو زائل نہیں ہونے دیتیں۔ حالانکہ وہ انھیں سجاتی اور سنوارتی ہیں۔ اپنے قلم اور موقلم سے انھیں آراستہ و پیراستہ کرتی ہیں لیکن اس طرح کہ ان کی اصل صورت مسخ نہ ہونے پائے۔

نشاط پروین افسانے کی تعمیر و تشکیل کے لیے مکالموں کو بھی ایک لازمی جزیا عنصر قرار دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کردار گونگے نہیں ہوتے۔ ان میں قوتِ گویائی ہوتی ہے اور وہ وقت و حالات کے تحت زبان کھولتے ہیں اور اپنے ذہنی، فکری اور جذباتی ردعمل کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ حالانکہ کردار گونگے اور بہرے بھی ہو سکتے ہیں اور وہ اپنا ردعمل ظاہر کرنے کے لیے اپنی

زبان کی بجائے دوسرے اعضائے جسم سے نطق ونوا کا کام لے سکتے ہیں۔یعنی جو کردار بے زبان ہوتے ہیں وہ زبانِ بے زبانی سے کام لیتے ہیں اور ایما واشاروں میں یا جسمانی حرکات و سکنات سے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔فنکار یا افسانہ نگار ایسے کردار کے تہذیبی ،معاشرتی اور لسانی پسِ منظر سے واقف ہوتا ہے اور ان اشاروں کو الفاظ کا جامہ پہنا کر اسے گویائی عطا کر دیتا ہے لیکن نشاط پروین کے افسانوں میں کوئی گونگا بہرا کردار نہیں ہے۔

اس کتاب کا پہلا افسانہ ''بڑے گھر کی بہو'' ہے۔اس کہانی میں ''بہو'' مرکزی حیثیت کی حامل نظر آتی ہے۔وہ بہو بڑے گھر کی ضرور ہے لیکن بیٹی جس گھر گھرانے کی ہے، وہ پس ماندہ ہے اور کسی بھی زاوئے سے بڑے گھرانے کی بہو بننے کے قابل نہیں لیکن ایک مشہور کہاوت ہے کہ ''پیار نہ جانے جات کُجات'' وہ اپنے آپ میں چاہے جو بھی ہو،لیکن اس کا جو پسِ منظر بیان کیا گیا ہے وہ گھناؤنا نظر آتا ہے۔

قصہ یہ کہ بڑے گھر کے بیٹے بیٹیاں سب اپنی اپنی جگہ خوشحال تھے،صرف رضی کنوارا تھا۔شہر میں اچھی نوکری تھی۔ہر سنیچر کو گاؤں میں اپنے گھر چلا آتا اور سوموار کو واپس چلا جاتا۔لوگ یہی سمجھتے کہ والدین کی محبت میں گاؤں کے پھیرے لگاتا ہے لیکن بعد میں کھُلا کہ وہ گھر میں کام کرنے والی لڑکی کو دل دے بیٹھا تھا۔پھر والدین کی مرضی کے خلاف اس نے اس سے شادی کر لی۔لیکن والدین نے اس لڑکی کو بہو ماننے سے انکار کر دیا۔البتہ جب رضی کے یہاں ایک بچی ہوئی تو اسے دیکھ کر ماں کا دل پسیج گیا کیونکہ وہ تو اسی خاندان کا خون تھی۔یہاں امارت اور غربت کی کھائی یا طبقاتی کشمکش کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ذات برادری کا بھید بھاؤ بھی ہے۔جو سب سے اہم مسئلہ ہے وہ اس کام کرنے والی لڑکی کے پس منظر بالخصوص اس کی ماں سے متعلق ہے جو چال چلن کے اعتبار سے ایک گھناؤنے کردار کے طور پر اس کہانی میں اپنی

موجودگی درج کراتی ہے۔

ہاں! تو رضی کام کرنے والی لڑکی سے محبت کر بیٹھا تھا۔اسے اس بات سے کیا لینا دینا تھا کہ جس لڑکی کو وہ دل دے بیٹھا ہے اس کی ماں ہندو بنگالن تھی اور اس کے باپ سبحان نے اسے مسلمان کر کے شادی کر لی تھی۔وہ کلکتہ میں کوئی کام کرتا تھا۔وہ بیوی کو لے کر گاؤں آیا اور پھر اپنے کام پر چلا گیا۔لیکن بقول راوی:

''اس کی بیوی کو اس کے جانے کے پندرہ ماہ بعد ایک بچہ پیدا ہو گیا۔وہ سال دو سال پر کبھی کبھار گاؤں آتا لیکن اس کی بیوی ہر سال ایک بچے کی ماں بن جاتی۔گاؤں کے شرفاء کو منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو چاہیے تھا۔''

آخری جملے سے ظاہر ہے کہ جوہی کی ماں ہی بدچلن نہیں تھی بلکہ شرفاء میں شمار کیے جانے والے گاؤں کے لوگ بھی،اور انھی میں سے کسی کے نطفے سے شریف زادی جوہی بھی تھی، جو نامساعد حالات میں اپنی ساس کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر کے شریف زادی ہونے کا ثبوت فراہم کر دیتی ہے۔نقطۂ عروج اور وحدتِ تاثر کے لحاظ سے اس افسانے کی کامیابی خود کو منوالیتی ہے۔

نشاط پروین نے فنّی لوازم کے برتاؤ میں ایما واشارہ اور علامت واستعارہ سے بالعموم اور بالقصد کام بھی نہیں لیا ہے۔انھوں نے فقرے اور جملے بھی ایسے نہیں تراشے ہیں جو دورانِ مطالعہ یا دورانِ قرآت پائے نگاہ کی زنجیر بن جائیں لیکن ان کے افسانے دلچسپی سے خالی نہیں۔تجسس اور تحیر کے عناصر کے ساتھ ساتھ ایسے نکات بھی ہوتے ہیں جو دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتے ہیں۔اور یہ سلسلہ اس افسانوی مجموعے کے عنوان ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ایک افسانہ ہے ''رانگ نمبر'' اور یہی اس مجموعے کا سرنامہ بھی ہے۔کہانی ایک نالائق بیٹے کی ہے۔قصے کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے۔

''آج اظہار صاحب اور رقیہ بیگم بہت خوش تھے۔خوش بھی کیوں نہ ہوتے بھولے بسرے بیٹے نے فون کیا تھا اور دہلی آنے کی دعوت دی تھی۔اشفاق نے بتایا کہ آپ کے پوتے کی سالگرہ ہے۔آپ لوگ آئیں گے تو بہت اچھا لگے گا'' کہاوت ہے کہ مول سے سود زیادہ پیارا ہوتا ہے۔اشفاق جیسی اولاد کو تو غیرت مند والدین اگر عاق نہ کریں تب بھی راندۂ درگاہ تو کر ہی دیتے ہیں۔سات برسوں کے طویل فاصلے کے بعد اظہار صاحب اور رقیہ بیگم کے لیے اشفاق بھولی بسری اولاد بن گیا تھا۔انٹر پاس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے اسے دہلی بھیجا گیا تھا جہاں اس نے دو سال بعد ہی تعلیم کو نامکمل چھوڑ کر کسی چھوٹی موٹی کمپنی میں ملازمت اختیار کر کے عالیہ نام کی کسی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔والدین فون کرتے تو وہ ریسیو نہیں کرتا۔والدین بھی تھک ہار کر صبر کرنے پر مجبور ہو گئے۔لیکن عرصۂ دراز کے بعد جب اشفاق کا فون آیا اور پوتے کی سالگرہ کے حوالے سے دلی آنے کی دعوت دی گئی تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔وہ سب کچھ بھول بھال کر دہلی جانے کی تیاری کرنے لگے اور پھر دہلی کی ٹرین میں سوار ہو گئے۔راستے بھر خوش خیالیوں یا خوش فہمی میں مبتلا رہے۔انھیں تو پوتے نے بھی اپنی توتلی زبان میں مدعو کیا تھا۔ٹرین اپنی سرعتِ رفتار کے ساتھ دہلی اسٹیشن کی طرف بڑھتی رہی۔وہ فون کے ذریعہ اشفاق کے رابطے میں رہے۔یہ بات واضح ہو گئی کہ اشفاق انھیں ریسیو کرنے اسٹیشن آ رہا ہے۔والدین کے لیے وہ گھڑی کتنی مبارک و مسعود ہونے والی تھی جو وہ سات سات سال بعد اپنے بیٹے کی صورت دیکھتے۔کہانی آگے بڑھتی ہے اور کئی اُتار چڑھاؤ کے بعد اختتام کو پہنچتی ہے اور قاری کلائمکس پڑھ کر چونک اُٹھتا ہے۔بے شک یہ ایک بہترین افسانہ ہے۔

نشاط پروین کے دوسرے افسانے بھی کسی نہ کسی جہت سے توجہ طلب اور متاثر کن ہیں۔ایسے ہی افسانوں میں ایک وہ بھی ہے جس کا عنوان ہے ''کیا بھروسہ ہے زندگانی کا'' اور عنوان سے مناسبت رکھنے والا یہ پہلا جملہ بھی توجہ طلب ہے۔''انسان ابھی ہے، ابھی نہیں ہے

یہ سوچ کر کچھ عجیب سا لگتا ہے۔'' عنوان اور ابتدائی جملے سے قنوطیت اور یاسیت کا رجحان واضح ہے۔لیکن زندگی کے اس آخری انجام سے آنکھیں کون چرا سکتا ہے۔یہ وہ المیہ ہے جو انسان کو زندگی کا شعور عطا کرتا ہے۔تزکیۂ نفس جسے ارسطو نے کتھارسس کہا انسانی زندگی کے لیے سبق آموز اور عبرتناک ہے۔چند ابتدائی جملے اور دیکھیں:

''مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ بڑی پھوپھی اب نہیں رہیں۔جنھوں نے اپنے بال بچوں کی دنیا آباد کی وہ خود اس دنیا سے منھ موڑ گئیں۔'' یہ انداز و اسلوب اور یہ متاسفانہ لہجہ کیا تجسس اور تحیّر کے عناصر سے ہمکار ہو کر قاری کے ذوقِ مطالعہ کو مہمیز نہیں کرتا؟ قصے، کہانی کی ابتدائی سطریں ایسی نہ ہوں تو دلچسپی کے عناصر کا فقدان سامع یا قاری کو متوجہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کے ذوقِ مطالعہ کو تحریک دے سکتا ہے۔اس لیے باشعور کہانی کار یا افسانہ نگار ایک بار نہیں سو بار سوچتا ہے کہ وہ اپنی بات کہاں سے اور کس طور شروع کرے کہ قاری کہانی کی رفتار کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھتا رہے۔اس کا ذہنی ارتکاز انتشار کا شکار نہ ہو۔

اس کہانی کا مرکزی کردار پھوپھی ہیں جو اب نہیں رہیں۔انھوں نے نامساعد حالات میں اپنے بال بچوں کی زندگیاں سنوارنے اور ان کی دنیا آباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔اس کہانی میں انھی کی سیرت اور کردار کو اُجاگر کرنے پر ساری توجہ صرف کی گئی ہے۔کہانی فلیش بیک کی تکنیک میں چلتی ہے اور انجام کو پہنچتی ہے۔پہلے تو پھوپھی بیوہ ہوئیں کیونکہ پھوپھا ایک حادثے کا شکار ہو کر جاں بحق ہو گئے۔لیکن شوہر کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد بھی نڈھال نہ ہوئیں کیونکہ ان انھیں تن تنہا اپنے بال بچوں کی زندگیاں سنوارنی تھیں۔اور وہ اپنے اس ارادے میں کامیاب بھی ہوئیں۔بال بچے پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے۔اچھی اچھی ملازمتوں میں آئے اور اس سلسلے میں اپنے وطن سے دور رہے لیکن گھر کا خیال رکھا۔پھوپھی نے بڑی دھوم دھام سے بڑی بیٹی

کا بیاہ رچایا، دل کھول کر ارمان نکالے۔ ایک نواسی بھی ہوئی جسے دیکھ کر وہ پھولی نہ سماتیں۔ اسے گود میں لیے پھرتیں۔ نشاط پروین نے اس ننھی بچی کا جو حلیہ تراشا ہے وہ بھی قابلِ دید ہے۔ اسے دیکھ کر گویا پھوپھی اپنا ذاتی غم بھی بھول جاتی ہیں۔ لیکن پھر غم کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ داماد کسی حادثے کے شکار ہو جاتے ہیں اور بیٹی بھی بیوہ ہو جاتی ہے۔ اس کی پہاڑ جیسی زندگی اور بیوگی کا غم بھی پھوپھی کو جھیلنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ کسی پر اس غم کو ظاہر ہونے نہیں دیتیں۔ البتہ اندر سے وہ ٹوٹتی بکھرتی رہتی ہیں اور بالآخر ایک دن دنیا سے منھ موڑ لیتی ہیں۔ موت تو آنی ہی ہے چاہے جس بہانے سے آئے، جب آئے۔ لیکن زندگی میں آنے والے غموں کا وہ مردانہ وار مقابلہ کرتی ہیں۔ تنکا تنکا سمیٹ کر اپنے کنبے کا شیرازہ تعمیر کرتی ہیں۔ وہ خود تو اندر اندر ٹوٹتی بکھرتی رہتی ہیں لیکن اپنے خون پسینے سے تعمیر کردہ شیرازے کو منتشر نہیں ہونے دیتیں۔ اس طرح قاری کے دل و دماغ میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ایسی ہی عورت گھر کو جنت نظیر بنا سکتی ہے۔ کرداری افسانوں میں یہ ایک اہم اضافہ ہے۔

نشاط پروین کے دوسرے افسانے مثلاً ''ہم سفر''، ''سہیلی''، ''شبانہ''، ''گیم''، ''بیتے ہوئے دن''، ''ماں''، ''پیار''، جھوٹا سچ''، ''کوئلہ بھئی نہ راکھ''، ''شور''، ''واپسی'' اور ''کرچیاں'' بھی کسی نہ کسی جہت سے قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ یہ سارے افسانے ذاتی مشاہدات وتجربات کی روشنی میں معرضِ تخلیق میں آئے ہیں۔ زبان و بیان اور عبارت آرائی کے لحاظ سے سے بھی یہ افسانے توجہ طلب ہیں۔ حجم وضخامت بھی مناسب ہے۔ نہ زیادہ مختصر اور نہ زیادہ طویل۔ پڑھئے تو پڑھتے جایئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کے حساس قارئین کے حلقے میں دور تک اس افسانوی مجموعے کی پذیرائی ہوگی۔

◀◀ ● ▶▶

ڈاکٹر منظر اعجاز۔ پٹنہ

رانگ نمبر

آج اظہار صاحب اور رقیہ بیگم بہت خوش تھے۔ خوش بھی کیوں نہ ہوتے، بھولے بسرے بیٹے نے فون کیا تھا اور دہلی آنے کی دعوت دی تھی۔ اشفاق نے بتایا کہ آپ کے پوتے کی سالگرہ ہے۔ آپ لوگ آئیں گے تو بہت اچھا لگے گا۔

انہوں نے اپنے بیٹے کو بہت ارمانوں کے ساتھ پالا تھا۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش کو پورا کیا تھا اور جب اس نے انٹر پاس کر لیا تو اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے دہلی بھیج دیا۔ لیکن وہاں جانے کے دو سال بعد ہی اس نے اپنی پسند سے شادی کر لی۔ اس نے تعلیم ادھوری چھوڑ دی تھی اور کسی کمپنی میں چھوٹی موٹی نوکری کر لی تھی۔ والدین سے اس کا رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ یہ لوگ فون کرتے تو وہ ریسیو نہیں کرتا تھا۔ یہ باتیں انہیں دوسرے لوگوں سے معلوم ہوئیں۔ انہیں بہت برا لگا۔ کوئی ان کے منھ پر تو کچھ نہیں کہتا تھا مگر پیٹھ پیچھے پتہ نہیں کیا باتیں بناتے تھے۔ وہ لوگ بہت اداس اور دکھی رہنے لگے تھے مگر پھر انہیں صبر آ گیا اور وہ اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن ایک دوسرے کی رفاقت میں گزارنے لگے۔

سات سال کا طویل عرصہ بیت چکا تھا۔ اس عرصے میں اشفاق نے کبھی اپنے والدین کی خبر نہ لی تھی۔ اب اتنے برسوں بعد بیٹے کی آواز سننے کو ملی تھی۔ ایک دن اچانک ایک توتلی آواز نے دادا اور دادی کو وہاں جانے کے لیے مجبور کر دیا۔ ان کے پوتے نے اپنی میٹھی اور پیاری آواز میں انہیں انوائیٹ کیا اور کہا کہ دادو اور دادی آپ چلو آیئے ہماری سالگرہ پر۔ ممی پاپا نے بڑی پارٹی رکھی ہے۔ آپ لوگ کو آنا ہوگا۔ بھلا پوتے نے اتنے پیار سے بلایا تھا۔ کیسے

نہ جاتے، سو جانے جانے کی تیاری شروع ہوگئی۔

''ہلو ہلو ہاں بیٹا اب ٹرین پہنچنے ہی والی ہے۔ آؤٹر پر رکی ہوئی ہے۔ تم بھی اسٹیشن آجاؤ۔''

''ہاں امی! ابھی آتا ہوں۔ آپ لوگ انتظار کریں۔ میں جام میں پھنسا ہوا ہوں۔''

اسٹیشن آچکا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی۔ وہ دونوں ٹرین سے اتر کر اب اشفاق کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر گزر جانے کے بعد پھر فون لگا کر پوچھا تو اشفاق نے بتایا کہ میں عالیہ کو بھیجتا ہوں۔ وہ آپ کو گھر لے کر آجائے گی۔

''اچھا بیٹا!'' اتنا کہہ کر ماں نے فون کاٹ دیا۔

اظہار صاحب رقیہ بیگم سے باتیں کرنے لگے۔ وہ دنوں اپنے پوتے کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھے لیکن اشفاق کا ابھی تک پتہ نہیں تھا۔ اظہار صاحب نے پھر فون لگایا۔

''ہاں بیٹا کہاں رہ گئے؟ ہم لوگ کب سے انتظار کر رہے ہیں؟ تمہاری ماں پریشان ہو رہی ہے۔ بیٹا ایڈریس ہی بتا دو۔ ہم لوگ خود ہی آجائیں گے۔''

اشفاق نے کہا ''میں عالیہ کو فون کر دیتا ہوں۔ وہ آپ لوگوں کو گھر لے کر آجائے گی۔''

اظہار صاحب اور رقیہ بیگم بہت پریشان ہو رہے تھے کہ اتنا وقت ہو گیا ابھی کوئی ریسیو کرنے نہیں آیا۔ انتظار کی گھڑیاں بڑی لمبی ہوتی ہیں۔ دونوں ویٹنگ روم میں بیٹے بہو کا انتظار کر رہے تھے۔ گھڑی کی سوئی نے وقت کے رفتار کو تیز کر دیا۔ تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ رقیہ بیگم نے پھر فون لگایا اور پوچھا کہ کب آؤ گے بیٹا بہت دیر ہو گئی ہے۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہ سکتی۔''

''امی میں جام میں ایسا پھنسا کہ بری طرح تھک گیا۔ میں گھر آ گیا ہوں۔ عالیہ پہنچنے

والی ہوگی۔ وہ آپ لوگوں کو لے کر آجائے گی۔'' ماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ان کے دل کو بہت گہرا صدمہ پہنچا۔ وہ نڈھال ہو گئیں۔ اظہار صاحب پوچھتے رہے کہ بیٹے سے کیا بات ہوئی لیکن وہ بتاتیں بھی تو کیا بتاتیں کہ ابھی اور انتظار کرنا ہے۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ اچانک ان کی طبیعت خراب ہونے لگی۔ ان کے پیٹ میں درد ہونے لگا اور وہ درد سے کراہنے لگیں۔ اظہار صاحب نے انہیں پانی پلایا اور میڈیکل شاپ کی تلاش میں باہر نکل گئے۔ انجان جگہ، انجان راستے۔ انہیں دوا کی کوئی دکان نہ ملی۔ وہ واپس اسٹیشن چلے آئے۔ رقیہ بیگم کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اظہار صاحب نے پھر فون لگایا لیکن اس بار تو غضب ہو گیا۔ فون ریسیو کرنے والی ایک لیڈی تھی۔ اس نے کہا آپ کون بول رہے ہیں کہاں فون لگایا ہے؟ اظہار صاحب نے بتایا یہ اشفاق کا نمبر ہے نا! تم عالیہ بول رہی ہو؟ میں اشفاق کا پاپا بول رہا ہوں۔ تم کہاں ہو؟ تم ہم لوگوں کو لینے کے لیے اسٹیشن آنے والی تھی۔ ادھر سے آئی آواز سہما دینے والی تھی۔

''ہلو، ہلو کون، کون؟ یہ رانگ نمبر ہے۔'' اس کے بعد فون کٹ گیا۔ انہوں نے پھر فون لگایا تو ادھر سوئچ آف تھا۔

اظہار صاحب کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی کہ اب کیا کریں کہاں جائیں۔ ادھر رقیہ بیگم کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔

ایک اجنبی انہیں بہت دیر سے دیکھ رہا تھا۔ وہ شخص ان کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کہ کیا بات ہے مجھے بتائیے۔ میں شاید آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔ اظہار صاحب نے اسے ساری باتیں بتائیں۔ اس اجنبی نے بتایا کہ میں اسٹیشن ماسٹر ہوں۔ مجھ پر بھروسہ کریں۔ میں ابھی دوا لے کر آتا ہوں۔ آپ آنٹی جی کا خیال رکھیں۔ اچانک انہیں وہ اجنبی اپنا سا لگنے لگا۔ کچھ ہی منٹوں میں وہ دوا لے کر آ گیا ساتھ میں کچھ کھانے پینے کا سامان بھی تھا۔ دوا دیتے ہوئے اس

نے کہا تھا یہ دوا کھلا دیں۔ آرام مل جائے گا۔ اظہار صاحب اور رقیہ بیگم بہت خوش ہوئے کہ اس اجنبی شہر میں ایک غیر انسان اپنا بن گیا جو اپنے تھے وہ غیر بن گئے۔ رقیہ بیگم نے دوا لی تو انہیں درد سے راحت مل گئی۔ اب وہ بہتر محسوس کر رہی تھیں۔ اس دوران اسٹیشن ماسٹر دو ٹکٹ لے کر آیا اور اس نے کہا اس بڑے شہر میں بیٹا بلا تو لیتا ہے، لیکن لینے نہیں آتا۔ اس شہر میں ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے۔ آپ ایسا کریں کہ ایک ٹرین ۱۱ر بجے ہے۔ اسی سے واپس ہو جائیں۔ ابھی ٹرین آنے ہی والی ہے۔ چلیے میں آپ کو ٹرین میں بٹھا دوں۔

''اچھا بیٹا!'' کہہ کر اظہار صاحب بوجھل قدموں سے سامان سمیٹتے ہوئے ٹرین کی طرف بڑھنے لگے۔ رقیہ بیگم بھی تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی ڈبے میں سوار ہو گئیں۔ اسٹیشن ماسٹر نے انہیں ٹرین میں بٹھا کر اپنا انسانیت کا فرض ادا کیا۔ دونوں یہ سوچ رہے تھے کہ ایک اجنبی انسان اتنا جانا پہچانا ہو گیا.....اپنوں سے زیادہ اپنا ہو گیا۔ دونوں نے مل کر ایک ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا۔ ٹرین کھل گئی تھی۔ دونوں گم سم سے اپنی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ تبھی فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے فون ریسیو کیا تو ادھر سے آواز آئی۔

''پاپا آپ لوگ کدھر ہیں؟ میں لینے آ رہا ہوں۔''

اظہار صاحب نے دھیرے سے کہا۔

''یہ رانگ نمبر ہے۔'' اور فون کاٹ دیا۔

ادھر سے اشفاق ہیلو ہیلو کہتا رہ گیا۔

◀◀ ● ▶▶

بڑے گھر کی بہو

موبائل فون کی گھنٹی سنتے ہی زرینہ چونک پڑی۔

فون اس کی چھوٹی بہن سلمیٰ کا تھا۔ وہ آجکل اپنے بچوں کو لے کر میکے آئی ہوئی تھی۔ ابھی پانچ منٹ قبل تو اس سے ایک گھنٹہ تک بات ہوئی تھی اور اپنے خاندان کے علاوہ گاؤں کے ہر ایک کی خیریت معلوم ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ موسم کے بدلتے ہوئے مزاج اور گھر کی مرغیوں اور کبوتر تک کا اسٹیٹس اپ ڈیٹ کیا جا چکا تھا۔ کورونا کی دوسری لہر اور اس سے ہونے والی پریشانیوں کا بھی تذکرہ ہوا تھا۔ اب ایسی کون سی بات رہ گئی تھی جس کے لیے دوبارہ فون کرنے کی ضرورت آن پڑی۔ اس نے فون ریسیو کیا تو ادھر سے سلمیٰ کی روتی بلکتی آواز سن کر اس کا کلیجہ کانپ گیا۔ اس کے والد کے انتقال کو بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ زخم ابھی تازہ ہی تھا کہ والدہ کو دل کی تکلیف شروع ہو گئی۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی کام کرنے والی والدہ بہت کمزور ہو چکی تھیں۔ الٰہی خیر! اس نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا۔

''کیا ہوا سلمیٰ؟ ارے کچھ بولو تو سہی۔''

''امّی.....امّی.....!'' سلمیٰ ہچکیوں میں بولی۔

''ارے کیا ہوا امّی کو؟ بتاؤ تو سہی۔''

سلمیٰ نے رک رک کر بتانا شروع کیا کہ امّی آنگن میں پھسل کر گر گئی ہیں۔ رضی بھیا انہیں گاڑی کے ذریعہ ڈاکٹر کے پاس شہر لے گئے ہیں۔ شہر بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ گاؤں میں تو کوئی ڈاکٹر تھا نہیں۔ اسی شہر میں ان کی بہن روبینہ

بھی رہتی تھی۔ اوراب وہ دونوں کے پہنچنے کا انتظار کر رہی تھی۔

موبائل بند ہو چکا تھا اور زرینہ اسے ہاتھ میں لیے دھم سے صوفے پر گر پڑی۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ پھر جب ذرا اوسان بحال ہوئے تو وہ دعائیں پڑھنے لگی۔

ابھی دن کے گیارہ بجے تھے۔ گھر کا بہت سارا کام پڑا تھا۔ مگر اب اسے ہوش کہاں تھا۔ ایک ایک منٹ اس پر بھاری ہو رہا تھا۔ کب امّی شہر پہنچیں گی، کب ڈاکٹر دیکھے گا، کب علاج شروع ہوگا؟

بیٹھے بیٹھے اس کی نظروں میں امّی کا چہرہ گھوم گیا۔ دبلی پتلی، سیدھی سادی، کم سخن امّی .....ابا کے انتقال کے بعد تو جیسے ٹوٹ سی گئی تھیں۔ یوں تو بھرا پُرا گھر تھا۔ تین بیٹے اور تین بیٹیاں۔ دو بیٹیوں کی شادی نہایت اونچے گھرانوں میں ہوئی تھیں۔ امّی ابّا کی خواہش تھی کہ رضی کی شادی بھی کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے ہو۔ رضی پڑھا لکھا تھا۔ اسمارٹ اور خوبصورت تھا۔ ایک پرائیویٹ کمپنی میں اچھی نوکری تھی۔ شہر میں ایک فلیٹ لے کر شان سے رہتا تھا۔ اس کے لیے اچھے اچھے رشتے بھی آرہے تھے لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ صاحب زادے نے کچھ اور ہی گل کھلا رکھے ہیں۔ وہ ہر سنیچر کو گاؤں آتا اور سوموار کی صبح چلا جاتا۔ اس کے علاوہ ہر چھٹی میں بھی گاؤں آتا۔ لوگ سمجھتے کہ ماں باپ اور بھائی بہنوں کی محبت میں آتا ہے لیکن وہ تو گھر میں کام کرنے والی لڑکی سے محبت کر بیٹھا تھا۔ اس لڑکی کا قصہ بھی عجیب وغریب تھا۔ باپ سبحان تو اسی گاؤں کا رہنے والا تھا مگر ماں بنگالن ہندو تھی۔ سبحان مزدوری کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ کام کی تلاش میں کلکتہ گیا اور وہاں کافی دن رہا۔ واپسی پر اس کے ساتھ ایک نوجوان سانولی سی لڑکی تھی۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ ایک بے سہارا لڑکی تھی جسے اس نے مسلمان بنا کے شادی کر لی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایسی باتوں پر کسی پر مقدمہ چلتا تھا نہ کسی کی لنچنگ ہوتی تھی اور نہ ہی لو

جہاد (Love Jihad) کی اصطلاح ایجاد ہوئی تھی۔ گاؤں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لہٰذا بات آگے نہیں بڑھی۔ پھر یہ ہوا کہ سبحان تو کام کرنے کے لیے دوبارہ کلکتہ چلا گیا اور دو برسوں تک گھر نہیں آیا لیکن اس کی بیوی کو اس کے جانے کے پندرہ ماہ بعد ایک بچہ پیدا ہو گیا۔ وہ سال دو سال پر کبھی کبھار گاؤں آتا لیکن اس کی بیوی ہر سال ایک بچے کی ماں بن جاتی۔ گاؤں کے شرفاء کو منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو چاہیے ہی تھا۔ وقت گزرتا گیا اور اس کے بچے بڑے ہوتے گئے۔ انہی میں ایک لڑکی جو ہی بھی تھی جو رضی کے یہاں کام کرتی تھی۔ وہ بچپن سے ہی اس گھر میں رہتی آرہی تھی اور اس گھر کے سارے قاعدے قانون سے واقف تھی۔ نشست و برخاست اور آدابِ گفتگو شریفوں جیسے تھے۔ خاصی خوبصورت تھی اور رضی اسی کی نگاہِ ناز کا شکار ہو گیا تھا۔

پھر ایک روز جو ہی غائب ہو گئی۔ ہر جگہ اس کی تلاش ہوئی مگر اس کا کچھ اتا پتا نہ چلا۔ باپ تو کلکتے میں تھا۔ ماں رو دھو کر چپ ہو رہی۔ لیکن اچانک ایک روز زبردست انکشاف ہوا۔ گاؤں کے کسی آدمی نے رضی اور جو ہی کو شہر میں ایک ساتھ گھومتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے آکر سارے گاؤں میں یہ بات پھیلا دی۔ رضی کے والد ہاشم صاحب اور والدہ رقیہ بیگم کو اس بات پر ذرا بھی یقین نہ آیا۔ انہیں اپنے خون پر پورا بھروسہ تھا۔ نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اس ہفتے جب رضی گھر آیا اور اس سے اس بابت سوال کیا گیا تو وہ صاف مکر گیا۔ اور اس شخص کو برا بھلا کہنے لگا جس نے بقول اس کے یہ ''افواہ'' پھیلائی تھی۔ گھر والوں کو ویسے تو اس کی بات پر یقین ہو گیا تھا مگر شک کی ایک لکیر دل میں پڑ چکی تھی۔ چنانچہ رضی جیسے ہی شہر گیا ہاشم صاحب نے اپنے برادرِ اہل کو اس کے پیچھے روانہ کر دیا۔ اس کا نام بھگوت تھا اور وہ ان کا داہنا ہاتھ تھا۔ بھگوت صبح گیا اور شام لوٹا۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا اور سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے ٹوٹے ہوئے

لہجے میں کہا۔

''ہاں مالک! رجی بابو نے سچ مچ بیاہ کرلیا ہے اور وہ انہی کے ساتھ رہتی ہے۔''

یہ سن کر لمبے چوڑے ہاشم صاحب کسی بے جان شہتیر کی طرح بستر پر ڈھہ گئے۔ رقیہ بیگم سسکیاں لینے لگیں۔ ہوا اچانک جیسے رک گئی۔ صحن میں دانہ چگتی ہوئی مرغیوں نے حیرت کے ساتھ انہیں دیکھا اور کبوتر اپنی پرواز بھول گئے۔

راز کھل جانے کے بعد رضی کئی ہفتوں تک گھر نہیں آیا۔ پھر رقیہ بیگم نے بھگوت کو یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ اسے بلا لائے۔ اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ رضی آیا تو ان پر گھر والوں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ جوہی کو چھوڑ دے اور کسی اچھی جگہ شادی کرلے۔ مگر وہ نہ مانا۔ اس سے یہ بھی کہا گیا کہ ابھی ایک بہن کنواری ہے۔ اگر یہ بات پھیل گئی کہ اس نے ایک ایسی کم ذات لڑکی سے شادی کی ہے جس کے باپ کا پتا نہیں تو ہوسکتا ہے کہ بہن کی شادی میں اڑچن آئے۔ مگر وہ نہ مانا۔

اس طرح ایک سال گزر گیا۔

پھر ایک روز خبر ملی کہ رضی ایک بچی کا باپ بن گیا ہے۔ ماں باپ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس خبر سے وہ خوش ہوں یا رنجیدہ۔ دل میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ کاش! وہ پوتی کی پیدائش کا جشن مناتے لیکن ان کی خوشیوں کو تو وقت کا کالا ناگ ڈس گیا تھا۔ ایک دبی دبی سی خواہش ضرور تھی کہ وہ اس کو ایک نظر دیکھتے۔

پھر ایک روز رضی، جوہی اور اس کی بچی کو لے کر گاؤں آ گیا۔ بیوی کو میکے میں رکھا اور خود بچی کو لے کر گھر چلا آیا۔ جب راز کھل جاتا ہے تو آدمی شیر ہو جاتا ہے۔ اب نہ جھوٹ بولنے کی ضرورت تھی اور نہ شرمندہ ہونے کی حاجت۔ رقیہ بیگم آنگن میں چارپائی پر بیٹھی تھیں

کہ رضی نے پھلیے میں لپٹی بچی کو ان کی گود میں ڈال دیا۔ وہ چونک پڑیں اور ان کی نظر بے اختیار بچی کے مسکراتے ہوئے چہرے پر چلی گئی۔ وہ ہو بہو انہی کی تصویر تھی۔ خوب گورا رنگ، پتلے پتلے گلابی ہونٹ، بڑی بڑی ہرنی سی آنکھیں .....وہ تیزی کے ساتھ ہاتھ پیر ہلا رہی تھی۔ دادی پر نظر پڑی تو وہ مسکرا دی۔ اچانک انہیں اپنے سینے میں پیار کا سمندر ٹھاٹیں مارتا سنائی دیا۔ انہوں نے اسے بے اختیار اپنے سینے سے لگا لیا اور اسے چومنے لگیں۔ رضی یہ نظارہ دیکھ کر مسکرا پڑا۔ ہاشم صاحب باہر سے لوٹے تو انہوں نے ایک ننھی سی جان کو بیوی کی گود میں پایا۔ وہ پہلی ہی نظر میں ساری بات سمجھ گئے لیکن مردوں کا دل عموماً مضبوط ہوتا ہے۔ انہوں نے اس کی طرف ایک غلط انداز نگاہ ڈالی اور فریش ہونے کے لیے باتھ روم میں چلے گئے۔ پھر وہ حسبِ معمول کپڑے تبدیل کر کے آئے اور اپنی مخصوص جگہ پر جا کر بیٹھ گئے۔ چھوٹی بیٹی سلمٰی نے ان کے سامنے شام کی چائے رکھی اور ذرا سا رُک کر ان کے چہرے کو دیکھا۔ مگر کوئی ہلچل کوئی بے چینی نظر نہیں آئی۔ جب وہ چائے پی چکے تو رقیہ بیگم بچی کو لے کر سامنے آئیں۔ انہوں نے ایک اُڑتی ہوئی نظر بچی پر ڈالی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ آخر تنگ آ کر رقیہ بیگم نے کہا۔

''دیکھا اسے؟ یہ رضی کی بیٹی ہے۔''

''ہاں دیکھا۔'' انہوں نے مختصر سا جواب دیا اور اُٹھ کر باہر چلے گئے۔

چند دنوں بعد رضی شہر چلا گیا لیکن بیوی اور بچی کو گاؤں میں ہی چھوڑ گیا۔ اگلی دفعہ جب وہ گاؤں آیا تو سامان رکھ کر سیدھا سسرال گیا اور بچی کو اُٹھا کر لے آیا۔ رقیہ بیگم تو گویا اسے دیکھنے کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ انہوں نے لپک کر اسے گود میں لے لیا۔ رضی کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس کے دل میں یہ اُمید پیدا ہوئی کہ اس کے گھر

والے جلد ہی جوہی کو بہو کی حیثیت سے قبول کر لیں گے لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ رقیہ بیگم تو مان بھی جاتیں لیکن ہاشم صاحب اسے کبھی نہیں اپناتے۔ وہ چند برس قبل فوج سے سبکدوش ہوئے تھے۔ پرانے خیالات کے آدمی تھے۔ ان کے نزدیک خون، ہڈی اور ذات کی بڑی اہمیت تھی۔ گاؤں میں لمبی چوڑی پشتینی حویلی تھی۔ دور تک کھیتوں کا سلسلہ تھا..... کئی باغات تھے..... مچھلیوں بھرا تالاب تھا۔ انہوں نے بہت سارے جانور بھی پال رکھے تھے۔ گائے بکری سے لے کر مرغی، بطخ، کبوتر اور توتا سبھی ان کے پاس تھے۔ سب کچھ تھا ان کے پاس .....بس ایک چین نہیں تھا..... رضی کی نازیبا حرکت نے انہیں ہمیشہ بے چین رکھا۔

وقت گذرتا گیا۔ رضی کا آنا جانا لگا رہا۔ بچی دھیرے دھیرے بڑی ہونے لگی اور اس کا زیادہ تر وقت دادیہال ہی میں گزرنے لگا۔ خون میں ایک فطری کشش ہوتی ہے۔ بچی دادی سے بہت ہِل مِل گئی تھی۔ وہ بھی اس پر جان نچھاور کیے دے رہی تھیں۔ ہاشم صاحب کچھ بولتے تو نہیں تھے لیکن کبھی کبھی چوری سے اس کی جانب محبت کی نظر ڈال لیا کرتے تھے۔ ایک دن رضی نے رقیہ بیگم سے کہا۔

''امّی! میں جوہی کو لے کر شہر جا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ روحی آپ کے پاس رہے۔''

''مگر وہ ماں کے بغیر کیسے رہے گی۔''

''ابھی بھی تو زیادہ تر آپ ہی کے پاس رہتی ہے۔ وہاں شہر میں ہم دونوں کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہوگا۔''

اور اس طرح ننھی روحی دادی کے پاس رہنے لگی۔

پھر اس کے اگلے سال سلمیٰ کی شادی بھی ہوگئی۔ خوبیٔ قسمت سے بہت اچھا خاندان

ملا تھا۔ ہاشم صاحب اور رقیہ بیگم کے سینے سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

سال پر سال گزرتے گئے۔ رضی یکے بعد دیگرے چار بچوں کا باپ بن گیا۔ اس تمام عرصے میں اس نے بارہا کوشش کی کہ ہاشم صاحب جوہی کو اپنی بہو مان لیں لیکن انہوں نے مان کر نہیں دیا۔ البتہ پوتے پوتیوں پر نظرِ التفات ڈالنے لگے تھے۔

ہاشم صاحب کا منجھلا بیٹا سمیع تعلیم کے سلسلے میں زیادہ تر باہر رہا کرتا۔ اسے اپنے گھر والوں سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ تعلیم مکمل ہو جانے کے بعد اس نے ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری کر لی تھی اور ممبئی چلا گیا تھا۔ اب والدین کو اس کی شادی کی فکر ہوئی۔ وہ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن لوگوں نے گھیر گھار کر اس کی شادی کروا ہی ڈالی۔ وہ کچھ روز تو گھر پر رہا، پھر اپنی نئی نویلی دلہن کو لے کر ممبئی چلا گیا۔ اب گھر میں تین نفوس رہ گئے تھے۔ ہاشم صاحب، رقیہ بیگم اور چھوٹا بیٹا رفیع۔ رفیع کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ وہ کھلنڈرا مزاج کا تھا۔ پڑھنے لکھنے میں اس کا دل نہ لگتا تھا اور وہ دن بھر آوارہ گردی کیا کرتا تھا۔

کون انسان کب اس دنیا کو چھوڑ کر چلا جائے کہا نہیں جا سکتا۔ ایک روز ہاشم صاحب رات کا کھانا کھا کر سوئے تو پھر اُٹھے ہی نہیں۔ رقیہ بیگم کی تو گویا دنیا ہی لُٹ گئی۔ انہیں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی تھی۔ اس وقت گھر پر سوائے چھوٹے بیٹے رفیع کے اور کوئی نہیں تھا۔ لیکن ہوا کے دوش پر سوار ہو کر یہ خبر پوری دنیا میں پھیل گئی اور مغرب کے وقت تک دور نزدیک کے سارے رشتہ دار جمع ہو گئے۔ عشاء کی نماز کے بعد ان کی تجہیز و تکفین ہوئی اور اس طرح زندگی کا ایک باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

گزرتا ہوا وقت ہر شے پر گرد کی ایک ہلکی سی تہہ جما دیتا ہے۔ کسی کی موت کا غم بھی دھیرے دھیرے ہلکا ہوتا جاتا ہے اور لوگ اپنے اپنے مشغلوں میں لگ جاتے ہیں۔ لیکن اس

موت کے بہانے رضی کو ایک موقع مل گیا۔ وہ سب سے کہتا پھرتا۔ امّی اب بالکل اکیلی ہیں۔ انہیں کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ جو ہی پورا گھر سنبھال لے گی۔ لیکن ابھی بھی کوئی اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔

وہ اسی سوچ میں گُم تھی کہ کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دی تو زرینہ چونک پڑی۔ اس کے شوہر احتشام صاحب آ رہے تھے۔ اسے آنسوؤں میں ڈوبا دیکھ کر وہ بری طرح گھبرا گئے۔ اور جب انہیں صورت حال کا علم ہوا تو کہنے لگے۔

''امّی کے ہاتھ میں فریکچر ہو گیا ہے۔ بہت افسوس ہوا یہ جان کر اللہ انہیں جلد از جلد ٹھیک کر دے۔'' پھر کچھ سوچ کر بولے۔

''میرے لیے تو ابھی کہیں بھی جانا بہت مشکل ہے۔ بہت سارے کام پڑے ہیں۔ تم چاہو تو چلی جاؤ۔''

زرینہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''بچوں کو کس پر چھوڑ کر جاؤں گی۔ آپ تو گھر کا کوئی کام کرتے نہیں ہیں۔''

احتشام صاحب نے شرمندگی کے ساتھ نگاہیں جھکا لیں۔ پھر سنبھل کر بولے۔

''رضی سے پوچھ لو۔ اگر پیسوں کی ضرورت ہے تو میں بھیج دیتا ہوں۔''

زرینہ نے رضی کو فون لگایا۔ رضی نے کہا کہ وہ لوگ شہر پہنچ چکے ہیں۔ ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لے لیا گیا ہے۔ پہلے کووِڈ ٹسٹ ہوگا۔ پھر ایکسرے، اس کے بعد شاید آپریشن ہوگا۔

زرینہ نے پیسوں کے متعلق پوچھا تو وہ کہنے لگا۔

''پیسوں کی نہیں آدمی کی ضرورت ہے۔''

لیکن زرینہ دوسرے شہر میں تھی اور وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔

روبینہ اسی شہر میں تھی لیکن وہ بھی بال بچوں والی تھی۔ شوہر کا اپنا کاروبار تھا۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے تو ہسپتال جا سکتی تھی لیکن ہمہ وقت وہاں نہیں رہ سکتی تھی۔

سلمیٰ گاؤں میں اپنے بچوں اور چھوٹے بھائی کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔

سمیع اپنی بیوی کے ساتھ ممبئی میں تھا۔

زرینہ انہی خیالوں میں الجھی ہوئی تھی کہ موبائل پر میسیج ٹون بجی۔ رضی نے ویڈیو بھیجی تھی۔

زرینہ نے دیکھا۔ اسکرین پر چھوٹے گھر کی بیٹی لیکن بڑے گھر کی بہو، جو ہی ہسپتال کے بیڈ پر لیٹی اس کی امّی کی خدمت میں مصروف تھی۔

◂◂ ● ▸▸

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا

انسان ابھی ہے، ابھی نہیں ہے۔ سوچ کر کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا　　آدمی بلبلہ ہے پانی کا

مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ بڑی پھوپھی اب نہیں رہیں۔ جنہوں نے اپنے بال بچوں کی دنیا آباد کی وہ خود اس دنیا سے منہ موڑ گئیں۔ انہیں تو ابھی حج کو جانا تھا، اگر وہ وہاں چلی گئیں جہاں سے لوٹ کر کوئی واپس نہیں آتا۔ انسان اپنی زندگی میں کیا کیا پلان بناتا ہے، کیسے کیسے خواب دیکھتا ہے مگر ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہے۔ اور یہ شاید خدا ہی رضا تھی کہ میں نے ان کے انتقال سے بس تھوڑی ہی دیر پہلے انہیں دیکھا تھا۔ میرے نصیب میں شاید ان کا آخری دیدار لکھا تھا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ پوجا کی چھٹیوں میں وہاں گئی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر ہمیشہ کی طرح ان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ ان کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اندر سے اتنی بیمار ہیں۔ پچھلے مہینے تو ان کی حالت اتنی بگڑ گئی تھی کہ انہیں اسپتال میں داخل کرانا پڑ گیا تھا۔ میرے دل میں انہیں دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی مگر میں چاہ کر بھی انہیں دیکھنے نہیں جا سکی کیونکہ میرے ''اُن'' کے پاس چھٹیاں نہیں تھیں۔ بس دل مسوس کر رہ گئی۔ پھر خبر ملی کہ اب وہ پہلے سے بہتر ہیں اور گھر لوٹ آئی ہیں ہیں۔ دل کو یک گونہ تسلی ہوئی۔

وہ بڑی سے بڑی مصیبت کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ بڑی ہمت اور حوصلے والی خاتون تھیں۔ ان کی زندگی میں کئی حادثے ہوئے، کئی طوفان آئے، ان کے خرمن پر کئی بار بجلیاں گریں مگر ان کے چہرے پر شکن تک نہ آئی۔ اگر کبھی کوئی افسوس ظاہر کرتا تو کہتیں کہ اس میں کون

سی نئی بات ہے۔ دنیا تو غم اور خوشی دونوں کا نام ہے۔ دیکھو فلاں کے ساتھ ایسا ہوا، فلاں کے ساتھ ویسا ہوا، اگر میرے ساتھ بھی ہوا تو کیا برا ہوا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ انسان پریشانیوں کی گنتی کرنے میں تو ماہر ہے مگر خدا کی نعمتوں کا حساب بھول جاتا ہے۔

میں جب بڑی پھوپھی کی زندگی پر نظر ڈالتی تو آنکھوں کے سامنے ایک ایسی عورت کی تصویر آ جاتی ہے جو طوفان میں دیا جلائے کھڑی ہو۔ ابھی ان کی شادی کو چند ہی سال ہوئے تھے کہ ان کے شوہر یعنی میرے پھوپھا جان ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ ان دنوں میں بہت چھوٹی تھی اور ساری باتوں کو ٹھیک طور سے سمجھ نہیں پاتی تھی۔ بہت سی باتیں کانوں میں پڑتی رہتی تھیں۔ ان میں کچھ سمجھ میں آتی تھیں اور کچھ نہیں۔ گاؤں میں ان کا سسرال ہمارے گھر کے پاس ہی تھا۔ بیوگی کے بعد وہ چند مہینوں تک گاؤں میں رہیں پھر اپنے بچوں کو لے شہر شفٹ کر گئیں۔ شہر میں بھی ہم لوگوں کا ایک آبائی مکان تھا جس کے ایک حصے میں ان کا فلیٹ تھا اور دوسرے حصے میں ہم لوگوں کا۔ اب ان کی زندگی کا محور و مرکز ان کے بچے تھے۔ سبھوں کی تعلیم و تربیت اور شادی بیاہ کی ذمہ داری اب ان کے سر تھی اور انہوں نے یہ ذمہ داری نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ نبھائی۔ شوہر کی قلیل پنشن اور گاؤں سے آنے والی محدود آمدن ہی ان کی زندگی کا سہارا تھی۔ اور اتنی کم آمدنی میں بھی انہوں نے اپنے بال بچوں کی پرورش شاندار طریقے سے کی۔ اچھا کھانا عمدہ لباس اور بہترین تعلیم۔

وقت گزرتا گیا اور ننھے ننھے پودے تناور درخت میں تبدیل ہوتے گئے۔ بیٹے پڑھ لکھ کر برسر روزگار ہو گئے اور غیر ممالک میں جا بسے۔ روپے پیسے کی ریل پیل ہونے لگی لیکن بڑی پھوپھی جیسی تھیں ویسی ہی رہیں۔ پیسہ آ جانے سے ان کے رہن سہن اور طور طریقوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ پہلے بھی صابر و شاکر تھیں اور ابھی بھی وہ ہر حال میں خدا کا شکر بجا لایا کرتی تھیں۔ لیکن انسان کا مصیبت اور پریشانی سے تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بڑی بیٹی کی شادی

انہوں نے بڑی دھوم دھام سے کی اور دل کے سارے ارمان نکالے۔ شادی کے ایک سال بعد جب انہوں نے نواسی کا منہ دیکھا تو خوشی سے پھولی نہ سمائیں۔ کیسی نرم و نازک سی، پیاری پیاری گڑیا تھی ان کی نواسی۔ خوب گورا رنگ، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، ستواں ناک اور گلابی ہونٹ۔ نواسی کی آمد نے گویا ان کے جسم میں نئی روح پھونک دی تھی اور وہ اسے ہر وقت گود میں اُٹھائے پھرتیں۔ لیکن ابھی جی بھر کے خوش بھی نہ ہو پائی تھیں کہ تقدیر کا بے رحم طمانچہ اس خاندان کے منہ پر پڑا۔ ان کے داماد ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ بیٹی بیوہ اور نواسی یتیم ہو گئی۔ ان کے چہرے پر غم کی لکیریں نمایاں ہو گئیں لیکن جلد ہی انہوں نے خود پر قابو پا لیا۔ بیٹی کی پہاڑ جیسی زندگی سامنے کھڑی تھی۔ انہوں نے ہمت نہ ہاری اور بیٹی کا گھر ایک بار پھر بسا دیا۔

یادیں بہت ساری ہیں۔ کچھ روشن کچھ دھندلی، کچھ کھٹی کچھ میٹھی۔ انہیں قصے سنانے کا بڑا شوق تھا۔ اپنے گاؤں کے واقعات، خاندان بھر کی کہانیاں، عورتوں اور مردوں کے ناجائز تعلقات کے قصے۔ اور یہ سب باتیں مزے لے لے کر بیان کرتیں۔ انہیں اس وقت اس بات کا خیال نہ رہتا کہ آس پاس چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں بھی ہیں جو اُن کی باتوں کو غور سے سن رہے ہیں۔ اور انہیں خیال بھی کیسے آتا کیونکہ ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے وقت ان کی نگاہیں دور کہیں خلاؤں میں بھٹکتی رہتیں۔ وہ سناتی جاتیں اور ہم لوگ سنتے جاتے۔ افسوس کہ ماضی کی داستانیں سنانے والی آواز سدا سدا کے لیے خاموش ہو چکی ہے اور دل کے اندر سناٹا پھیلتا جا رہا ہے۔ لیکن باہر والوں کے کسی کے دل میں پھیلتے ہوئے سناٹے سے کیا مطلب؟

شہر بھر میں دسہرہ کی دھوم تھی۔ سڑکوں پر لوگوں کا ازدحام تھا۔ ہم لوگ بھی شام سے اس بھیڑ کا حصہ بنے گھوم رہے تھے۔ پھر ہم لوگ جب چلتے چلتے تھک گئے تب گھر جانے کے لیے مڑے۔ گلی میں داخل ہونے کے بعد پہلے بڑی پھوپھی کا گھر ملتا تھا۔ ہم لوگ ان کے گھر

بغیر دروازہ کھٹکھٹائے داخل ہو گئے۔ دروازہ تو غیروں کا کھٹ کھٹایا جاتا ہے، اپنوں کا نہیں۔ وہ تو ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اور میں اندر والے کمرے میں پھوپھی جان کے پاس چلی گئی۔ وہ بستر پر لیٹی تھیں۔ معلوم ہوا کہ آج طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ لیکن اس حال میں بھی وہ برابر بولے جا رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ ان کا سینہ زور زور سے چل رہا ہے اور انہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہے۔ مگر وہ اپنی تکلیف کو چہرے سے ظاہر ہونے نہیں دے رہی تھیں۔ ان کی نواسی فاطمہ ان کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر لگا کہ پھوپھی جان کا بلڈ پریشر کافی بڑھا ہوا ہے۔ مگر وہ تو مسلسل دھیرے دھیرے بولے جا رہی تھیں۔ پھر انہوں نے فاطمہ سے کہا کہ وہ خالو جان کو ناشتہ کرائے۔ ان کا اشارہ میرے شوہر کی جانب تھا۔ اس وقت گھر میں ان کی بڑی بیٹی اور بہوئیں بھی موجود تھیں۔ میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ محبت کی گرمی ان کی ہتھیلی سے پھوٹ رہی تھی۔ رات کے نو بج گئے تو ہم لوگ اپنے فلیٹ پر چلے گئے۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ فاطمہ کا فون آ گیا۔ اس نے بتایا کہ بڑی پھوپھی کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی ہے اور انہیں ہاسپٹل لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں ان کے لیے دعا مانگی اور پھر کچن میں مصروف ہو گئی۔

ابھی ایک گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ پھر کسی کا فون آیا۔ بڑی پھوپھی گزر گئیں۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی اور میں گرتے پڑتے پھوپھی کے فلیٹ کی جانب دوڑ پڑی۔ یہ کیسے ہو گیا؟ ابھی تھیں ابھی نہیں ہیں۔ کیا ان کی زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی؟ کیا ان کی آنکھیں سدا کے لیے بند ہو گئیں۔ دل ماننے کو تیار نہ تھا مگر حقیقت حقیقت ہے۔ ان کے فلیٹ پر کہرام مچا ہوا تھا۔ لوگ پریشان تھے۔ یہ اچانک کیا ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟ ہر شخص فون لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ آس پاس کے لوگ اور رشتہ دار سب جمع ہونے لگے۔ مرد ہاسپٹل کی طرف دوڑ پڑے اور ادھر میت کا

انتظار ہونے لگا۔فاطمہ ان کے ساتھ رکشے پر سوار ہو کر گئی تھی۔ مرد لوگ موٹر سائیکل پر تھے۔ہاسپٹل میں ان کے ٹیسٹ لیے گئے۔ بی پی اور بلڈ شوگر دونوں بڑھے ہوئے تھے لیکن ڈاکٹر نے کہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر انہیں ایک انجکشن لگایا گیا اور انہیں گھر واپس لے جانے کو کہا گیا۔ فاطمہ نے انہیں سنبھال رکھا تھا۔ان کی طبیعت کچھ سنبھلی اور وہ پھر فاطمہ سے باتیں کرنے لگیں۔شہر کی جگ مگ روشنیاں انہیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔لیکن اچانک باتیں کرتے ان کی گردن ڈھلک گئی۔ فاطمہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔اس نے رکشے والے کو رکنے کو کہا۔رکشے کے پیچھے پیچھے گھر کے جو لوگ موٹر سائیکل پر دھیرے دھیرے آ رہے تھے وہ بھی رک گئے۔رکشے کو واپس اسپتال کی جانب موڑ دیا گیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے انہیں مردہ قرار دے دیا اور ان کے چہرے کو چادر سے ڈھک دیا گیا۔ پھر یہ اندوہناک خبر پورے میں بجلی طرح پھیل گئی۔ان کا فلیٹ آدمیوں سے بھر گیا۔گلی بھی بھر گئی اور ہر شخص کی نگاہیں سڑک پر ٹک گئیں۔ اسپتال میں خانہ پُری ہوئی اور ان کا تابوت رات کے ایک بجے گھر پہنچا۔آہ و بکا کی صدا بلند ہوئی اور پوری فضا پر غم واندوہ کے بادل چھا گئے۔گھر کے لوگ تو میت کے ساتھ ساتھ فلیٹ کے اندر داخل ہو گئے۔ ہر طرف چیخ پکار کی آواز بلند ہو رہی تھی مگر میرے اندر سناٹا تھا،صرف سناٹا۔

◀◀ ● ▶▶

خوبصورت بلا

جما جمایا بسا بسایا گھر چھوڑ کر وہ لوگ کرائے کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آ گئے تھے۔اپنا گھر بار چھوڑنا کون چاہے گا؟ مگر تقدیر کے ہاتھوں انسان بے بس ہے۔لیکن کیا یہ صرف تقدیر کی بات تھی یا پھر تدبیر کی کمی تھی؟ خیر! وجہ کچھ بھی ہو ابھی وہ لوگ اس نئے فلیٹ کو ترتیب دینے میں مشغول تھے۔رضیہ،اس کا شوہر شاہد، بیٹی جولی اور اس کی ساس.....سائرہ بیگم۔

رضیہ نے اپنی بیٹی کی زندگی بچانے کے لیے اتنا بڑا قدم اُٹھایا تھا۔اسے ایسا لگنے لگا تھا کہ اس کے سسرالی گھر میں اس کی بیٹی کی زندگی خطرے میں ہے۔شاید اس پر کسی نے جادو کر دیا تھا۔اچھی خاصی ہنستی بولتی جولی اچانک چپ اور اداس رہنے لگی تھی۔ پڑھائی لکھائی سے اس کا من اچاٹ ہو گیا تھا،کھانے پینے سے اس کی دلچسپی ختم ہوتی جا رہی تھی۔وہ تنہائی پسند ہو گئی تھی اور زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں بند رہتی۔ بارہ سال کی لڑکی تو ہر وقت چہکتی رہتی ہے۔اس نے پہلے شاہد سے بات کی اور پھر اپنی ساس سے مشورہ کیا اور پھر سبھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس گھر کو چھوڑ کو کہیں اور شفٹ ہوا جائے اور اب وہ لوگ ایک نئی کالونی میں آن بسے تھے۔

لیکن اس نئے فلیٹ میں شفٹ ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ لاڈلی اور اس کی ماں کو ان کے ارادوں کا علم ہو۔رضیہ نے چپکے چپکے شہر کے کسی دور دراز علاقے میں نئے ٹھانے کی تلاش شروع کی اور آخر کافی محنت اور مشقت کے بعد یہ نئی جگہ ملی ۔اب وہ اس انتظار میں تھے کہ لاڈو اور اس کی ماں کہیں جائیں تو ان کے غائبانے میں وہ لوگ وہاں سے نکل لیں۔اور پھر وہ موقع بھی ہاتھ آیا۔لاڈو کسی مقابلے کا امتحان دینے دلی گئی۔اس

کے ساتھ اس کی ماں بھی گئی۔ بس انہیں موقع مل گیا اور یہ لوگ وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔

گھر کا سامان سیٹ کرنے میں کئی دن لگ گئے۔ حالانکہ بہت سارا سامان پرانے گھر کے ایک کمرے میں تالے میں بند کر آئے تھے پھر بھی ضروری سامان تو لانا ہی تھا۔ لہٰذا نہیں نہیں کر کے بھی کافی سامان ہو گیا تھا۔ اس نئے فلیٹ میں شفٹ کرتے وقت ان لوگوں نے کافی کوشش کی تھی کہ ان کے دشمنوں کو ان کے نئے ٹھکانے کا پتہ نہ چل سکے لیکن دشمن تو دشمن ہی ہے۔ اسے فوراً ان لوگوں کی جائے پناہ کا علم ہو گیا۔ اور دشمن بھی کون؟ ان کا دشمن کوئی مرد نہیں تھا بلکہ دو عورتیں تھیں۔ ایک ماں اور ایک بیٹی۔

کہتے ہیں کہ کسی ملک کا راجا بڑا سخی تھا۔ کوئی اس کے دربار سے خالی نہیں جاتا تھا۔ ایک روز اس کے پاس ایک فقیر آیا۔ راجا نے اس سے کہا۔ ''مانگو، کیا مانگتے ہو؟'' فقیر نے کہا۔ ''مجھے دو دن کے لیے اپنی سلطنت دے دیجئے۔ راجا نے آگے دیکھا نہ پیچھے۔ جھٹ دو دنوں کے لیے حکومت اس کے نام کر دی۔ دو دنوں کے بعد جب راجا نے فقیر سے سلطنت لوٹانے کے لیے کہا تو اس نے جواب دیا کہ اب یہ سلطنت میری ہے۔ سارے امیر، وزیر، سپاہی اور سپہ سالار میرا حکم مانتے ہیں۔ اب بہتر ہے کہ تم یہاں سے نکل جاؤ ورنہ تمہیں خاندان سمیت قتل کر دیا جائے گا۔ راجا اپنی نادانی پر بہت پچھتایا مگر اب پچھتاوے کیا ہوت، جب چڑیا چُگ گئی کھیت۔

رضیہ جلدی جلدی گھر کا کام نپٹاتی جا رہی تھی اور سوچتی جاتی تھی کہ کیا سے کیا ہو گیا دیکھتے دیکھتے۔ کہاں وہ وسیع و عریض کوٹھی، کہاں یہ تین کمروں کا چھوٹا سا فلیٹ۔ کہاں دائی ماماؤں کا قافلہ اور اب سارا کام اپنے ہاتھوں سے۔ اس کی ساس سائرہ بیگم اپنے گھر کی اکلوتی اولاد تھیں۔ روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ انہوں نے کبھی گھر کا کام اپنے ہاتھوں سے نہیں کیا تھا۔ جب وہ شادی کر کے اپنے سسرال پہنچیں تو ان کی عمر محض تیرہ سال تھی۔ دنیا کی اونچ نیچ

سے انجان وہ صرف اپنے شوہر وسیم صاحب کے حکموں پر چلنا جانتی تھیں۔ ان کے شوہر بھی خاندانی رئیس تھے۔ انہوں نے ہمیشہ سے ایک شاندار زندگی گزاری تھی۔ گھر میں کام کرنے والوں کی یوں تو کوئی کمی نہیں تھی مگر جب کوئی نیا آدمی کام کھوجنے آتا تو اسے بھی رکھ لیتے۔

ایک روز ایک جوان عورت کام کی تلاش میں آئی۔ وہ بلا کی حسین تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی بچی بھی تھی۔ وہ بھی اپنی ماں کی طرح خوبصورت تھی۔ وہ عورت بیوہ ہو چکی تھی اور کسی سہارے کی تلاش میں تھی۔ سائرہ بیگم کی شادی کو دس سال ہو چکے تھے اور اس دوران وہ تین بیٹوں کی ماں بن چکی تھیں۔ وسیم صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ ان کے گھر ایک بیٹی بھی ہو۔ مگر تیسرے بیٹے کی پیدائش کے وقت کچھ ایسا نقص پیدا ہو گیا تھا کہ اب وہ مزید ماں بننے کے قابل نہیں رہی تھیں۔

وسیم صاحب نے جب اس چھوٹی سی بچی کو دیکھا تو ان کے دل میں محبت کا جذبہ اُبھر آیا۔ اتنی خوبصورت، گوری چٹی، نیلی نیلی آنکھوں والی .....اور اس کی باتوں میں کتنی مٹھاس تھی۔ وسیم صاحب نے اس عورت کو فوراً کام پر رکھ لیا۔

دوسرے روز سے وہ کام پر آنے لگی۔ اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی ہوتی۔ وہ اپنی بیٹی کو ایک کونے میں بٹھا دیتی اور خود گھر کا کام نپٹانے لگتی۔ وہ بہت ہوشیار اور چاق و چوبند تھی۔ چند ہی دنوں میں اس نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔ گھر کے کام کے ساتھ ساتھ وہ سائرہ بیگم کی خدمت بھی کرنے لگی۔ ان کے ہاتھ پاؤں دباتی اور ان کے آرام و آسائش کا ہر طرح سے خیال رکھتی۔ اور صرف اتنا ہی نہیں اس نے گھر کے سیاہ و سپید میں بھی دخل دینا شروع کر دیا۔ اب سارے فیصلے اس کے مشورے سے ہونے لگے تھے۔ دیوار میں کانٹی بہت اندر تک پیوست ہو گئی تھی۔

اس کی بچی کا نام لاڈلی تھا۔ لاڈلی کو اس گھر میں بہت لاڈ پیار کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔ ایک روز وسیم صاحب نے اعلان کر دیا کہ وہ لاڈلی کو گود لے رہے ہیں۔ اب تین بھائیوں کو ایک بہن بھی مل گئی۔ سب مل کر ساتھ کھاتے، ساتھ رہتے، ساتھ کھیلتے۔

اسی طرح دیکھتے دیکھتے لاڈلی چار برس کی ہوگئی۔ اس کا داخلہ شہر کے ایک اچھے اسکول میں کروادیا گیا اور باپ کے نام کی جگہ وسیم صاحب نے اپنا نام لکھوادیا۔

وقت گزرتا گیا اور لاڈلی اسکول سے کالج پہنچ گئی۔ کالج کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ اس نے کئی دوسرے کورس بھی کئے۔ وسیم صاحب نے بڑے دونوں بیٹوں کی شادی کر دی۔ گھر میں بہوئیں آئیں تو لاڈو کو بہت برا لگا۔ اس کی آزادی پر قدغن لگنے لگا۔ وسیم صاحب چاہتے تھے کہ اس کی بھی شادی ہو جائے مگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوتی تھی۔ اس کی ماں بھی اسی کی طرف داری کرتی تھی۔ گھر میں تناؤ رہنے لگا۔

چند سال قبل جب کورونا کی لہر آئی تو ان کا چھوٹا بیٹا اس کا شکار ہوگیا۔ اس کے انتقال کے بعد وسیم صاحب کچھ ٹوٹ سے گئے۔ وہ اسے بہت چاہتے تھے۔ چند ہی مہینوں بعد وہ بھی اس دنیا سے گزر گئے۔ اور پھر تیسرا حادثہ ہوا۔ ان کا بڑا بیٹا بھی دنیا سے منھ موڑ گیا۔ بہو بیوہ ہو کر اپنے میکے چلی گئی۔ پے در پے صدمے نے سائرہ بیگم کو دہلا کر رکھ دیا۔ ایک روز وہ گھر کے آنگن میں پھسل کر گر پڑیں۔ ان کے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ مہینوں بستر پر پڑی رہیں۔ دوسری بہو کی ایک بیٹی تھی..... جولی، جواب بارہ سال کی ہو چکی تھی۔ وسیم صاحب اور ان کے دو بیٹوں کی موت کے بعد لاڈلی اور اس کی ماں نے گویا پورے گھر قبضہ کر لیا۔ اب وہ دونوں مالکن تھیں اور یہ لوگ نوکر۔ ان دونوں نے طرح طرح سے انہیں بے دخل کرنے کی کوشش کی۔ رضیہ کا شوہر نہایت سیدھا سادا تھا۔ اس نے تعلیم تو حاصل کی تھی مگر دنیا داری سے کوسوں دور تھا۔ اور ایک روز جب

میں بیٹی نے جائداد میں سے حصہ مانگا تو اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ بصورت دیگر اس نے مقدمہ کرنے کی دھمکی بھی تھی۔ سائرہ بیگم اور رضیہ تو بالکل خلاف ہوگئیں۔ پال پوس کر، پڑھا لکھا کر بڑا کرنا اور بات ہے مگر زمین جائداد لکھ دینا اور بات ہے۔

انہی دنوں معلوم ہوا کہ لاڈلی کسی پیر صاحب کے یہاں جانے لگی ہے۔ پہلے تو ان لوگوں نے اس جانب کوئی توجہ نہیں دی لیکن جب جولی مسلسل بیمار رہنے لگی تو ان لوگوں کا دل کھٹکا۔ اور پھر جیسے ساری کڑیاں آپس میں ملتی چلی گئیں۔ لگاتار تین لوگوں کی موت، سائرہ بیگم کے ساتھ حادثہ اور اب یہ نئی مصیبت۔ رضیہ سمجھ گئی کہ ہونا ہو یہ سب لاڈلی کی کارستانی ہے۔ اور پھر اس نے اس حویلی کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اور وہ لوگ چپ چپاتے اس فلیٹ میں آ گئے تھے۔

رضیہ سمجھ رہی تھی کہ اب وہ لوگ چین سکون کے ساتھ رہیں گے۔ مگر کہاں؟ ایک روز صبح صبح فلیٹ کی گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو سامنے لاڈلی کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ایک وکیل تھا۔ رضیہ وہیں پر سر پکڑ کر بیٹھ رہی۔

◀◀ ● ▶▶

ثمن چچی کا گھر

ثمن چچی کا گھر گاؤں کے بالکل آخری سرے پر تھا۔ مٹّی کی دیواروں اور کھپریل سے بنا یہ گھر بہت کشادہ اور آرام دہ تھا۔ تین بڑے کمرے تھے۔ اوسارہ اور مٹّی کا آنگن جس میں طرح طرح کے پھول لگے تھے۔ ایک امرود کا گھنا پیڑ بھی تھا جو موسم میں پھلوں سے لد جاتا تھا۔ جب گھر پر کوئی نہ ہوتا تو گاؤں کے بچے دیوار پر چڑھ کر آنگن میں کود جاتے اور امرود توڑ لیتے۔ ایک دفعہ چچی نے غصے میں آ کر اس پیڑ کو کٹوا ڈالا لیکن اگلے ہی سال وہ پھر بڑا ہو گیا اور پھل دینے لگا۔ آنگن کے درمیان میں ایک گہرا کنواں تھا جس کا پانی بہت میٹھا تھا۔ چچا کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا۔ چچی کو دو بچے تھے۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ بیٹی فریدہ جب شادی کے لائق ہوئی تو چچی نے اس کی شادی کر دی۔ لڑکا تھا تو اسی گاؤں کا لیکن رہتا ممبئی میں تھا۔ وہ فریدہ کو اپنے ساتھ لے کر ممبئی چلا گیا۔ اب وہ کبھی کبھار سال میں ایک بار آ جایا کرتی تھی۔ بیٹا سرفراز پڑھنے میں تیز تھا۔ پہلے اس نے گاؤں کے اسکول میں تعلیم حاصل کی پھر آگے کی پڑھائی کے لئے شہر چلا گیا۔ چچی گھر میں اکیلی رہ گئیں۔ اب یہ ان کا روز کا معمول تھا کہ اپنے گھر کا کام نپٹا کر گاؤں میں نکل جاتیں اور مختلف گھروں میں جا کر اپنا وقت گزارتیں۔ چونکہ نہایت خوش اخلاق تھیں لہذا ہر جگہ ان کی آؤ بھگت ہوتی تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ سرفراز پڑھ لکھ کر برسر روزگار ہو گیا۔ انہوں نے اس خوشی میں پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹی۔ اب انہیں بیٹے کی شادی کرنی تھی لہذا انہوں نے لڑکی ڈھونڈنی شروع کی۔ مگر قسمت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا۔ سرفراز نے شہر ہی میں کوئی لڑکی پسند کر لی اور چپ

چپاتے شادی بھی کر لی۔ ثمن خالہ کو جب یہ خبر ملی تو انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ لیکن اب وہ کر بھی کیا کر سکتی تھیں؟ اولاد جب جوان ہو جاتی ہے تو ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ پھر ایک روز سرفراز اپنی بیوی کو لے کر گاؤں آ گیا۔ بہو انہیں ایک آنکھ نہ بھائی۔ دوہرا بدن، چوڑا منہ اور گھوڑی دُم جیسے بال۔ اس پر سے طرح طرح کے نخرے۔ لیکن انہوں نے خوشدلی کے ساتھ سب کچھ برداشت کیا۔ زندگی سرفراز کو گزارنی تھی۔ اب جو اس کی پسند اور اس کی خوشی۔ انہوں نے اپنے کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اس رشتے سے خوش نہیں ہیں۔ گاؤں کی عورتیں انکی بہو کو دیکھنے آتیں تو وہ سب کی سامنے اس کی تعریفیں ہی کرتیں۔

سرفراز کچھ دنوں تک تو وہاں رہا اور جب انے لگا تو کہنے لگا۔

''امّاں! تم اکیلی یہاں کیسے رہو گی؟ ہم لوگوں کے ساتھ شہر چلو۔ وہاں آرام سے رہو گی۔'' وہ تھیں تو ان پڑھ لیکن اتنی بات ضرور سمجھ گئیں کہ بیٹا انہیں دراصل اپنا گھر سنبھالنے کے لیے لے جانا چاہ رہا ہے۔ لیکن وہ جان کر بھی انجان بنی رہیں اور بیٹے بہو کے ساتھ شہر جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ واقعی ماں کی محبت کا کوئی بدل نہیں۔ وہ شہر چلی گئیں اور گھر کی چابھی اپنے پڑوسی رحیم میاں کو دے گئیں تا کہ گھر کی دیکھ بھال ہوتی رہے۔

تین مہینے شہر میں گزارنے کے بعد ان کا دل گھبرا گیا۔ انہوں نے بیٹے سے کہا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے گاؤں جانا چاہتی ہیں۔ بیٹے نے دوسرے ہی روز انہیں ٹرین میں بیٹھا دیا۔ کہنے لگا کہ اماں ابھی مجھے چھٹی نہین ہے نہیں تو میں تمہیں خود ہی پہنچا آتا۔ کچھ دنوں بعد میں تمہیں لینے آ جاؤں گا۔

دوسری صبح جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو انہیں کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ انہیں ایسا لگا جیسے کہ اس گھر میں کچھ ہوا ہے۔ ایک کمرے میں شراب کی کچھ خالی بوتلیں پڑی تھیں۔ تاش کے پھٹے ہوئے پتّے ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے اور سگریٹ کے ٹوٹے کمرے میں بھرے

ہوئے تھے۔انہیں نے جب رحیم میاں سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ دوروز قبل شرفو میاں کی بیٹی کی بارات آئی تھی۔ باراتی زیادہ تھے اور ٹھہرانے کی جگہ کم پڑ رہی تھی۔ چنانچہ شرفو میاں نے ان سے کہا کہ وہ ایک رات کے لیے خالہ کے گھر کی چابھی انہیں دے دیں تا کہ کچھ باراتیوں کو وہاں ٹھہرایا جا سکے۔ رحیم میں نے چابھی ان کے حوالے کردی اور اس طرح کچھ نوجوان باراتیوں نے وہاں رات گزاری۔ خالہ کو غصہ تو بہت آیا مگر اب وہ کیا کرسکتی تھیں۔انہوں نے کمر باندھی اور گھر کی صفائی میں جُٹ گئیں۔اس سے فارغ ہوکر جب وہ کوئیں سے پانی بھرنے آئیں تو ان کی چیخ نکل گئی۔

کنویں میں کسی کی لاش تیر رہی تھی۔

وہ گھبرا کر گھر سے باہر نکلیں اور ہانپتے کانپتے رحیم میاں کے پاس پہنچ کر انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ یہ ماجرا سن کر رحیم میاں کے ہاتھ پیر پھول گئے۔آن کی آن میں یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔تھوڑی دیر بعد پولس بھی پہنچ گئی۔لاش کو کنویں سے نکال کر پنچ نامہ تیار کیا گیا۔ یہ کسی نوجوان لڑکے کی لاش تھی۔لوگوں نے اندازہ لگایا کہ جوئے بازی کے جھگڑے میں اسے مار کر کنویں میں ڈال دیا گیا ہوگا۔ پولس نے بہت سارے لوگوں کا بیان لیا۔شرفو میاں سے بھی پوچھ تاچھ ہوئی اور پھر پولس نے چچی کے گھر کو سیل کر دیا۔

چچی نے وہ رات کسی دوسرے کے گھر میں گزاری اور صبح ہوتے ہی بیٹے کے پاس روانہ ہوگئیں۔

ان کا گھر ابھی بھی بند ہے۔البتہ گاؤں کے بچے امرود توڑنے کے لیے ان کے آنگن میں کودتے رہتے ہیں۔

◂◂ ● ▸▸

بیتے ہوئے دن

برسوں بعد وہ اپنے گاؤں آئی تھی۔چھوٹے بھائی نے فون پر کہا تھا۔

''آپی! اس بار آپ عید ہم لوگوں کے ساتھ منائیں تو بہت اچھا لگے گا۔'' نازو نے تو ہامی بھر لی لیکن اس کے شوہر ذرا آدم بیزار قسم کے شخص تھے۔غیر تو خیر غیر ہی ہیں وہ اپنوں سے بھی زیادہ ملنا جُلنا پسند نہیں کرتے تھے۔اکثر کہا کرتے کہ:

الگ رہیں تو جدائی میں ہائے ہائے کریں
جو ایک جا ہوں تو کم بخت زہر اگلنے لگیں
جدا رہیں تو جدائی میں آہ آہ کریں
مل کر بیٹھے تو یہ کمبخت زہر اگلا کریں
عجیب سلگتی لکڑیاں ہیں رشتے دار
الگ رہیں تو دھواں دیں، ملیں تو جلنے لگیں

نازو میکے جانے کے لیے تڑپتی لیکن اپنے شوہر کا منہ دیکھ کر رہ جاتی۔مگر اس بار بھائی نے اتنے پیار سے بلایا کہ وہ اپنے آپ کو روک نہیں سکی اور ضد کر کے گاؤں جانے کا پروگرام بنوا ہی لیا۔عید کے ایک دن قبل گاؤں جانے کی ٹھہری۔ میکے جانے کے نام پر وہ بہت خوش تھی۔وہاں کا ماحول کتنا اچھا ہوتا ہے۔ایک دوسرے کے لیے لوگ جان دینے کو تیار رہتے ہیں۔ ہر وقت ایک دوسرے کے گھر آنا جانا لگا رہتا ہے۔کوئی روک ٹوک نہیں۔کوی ڈور بیل نہیں بجانا، کسی کو دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی ہے۔بس خواہش ہوئی مل کر آ

گئے۔گاؤں تو گاؤں ہی ہوتا ہے نا!

''نازو! نازو!! جلدی چلو بھئی دیر ہو رہی ہے۔'' شوہر کی آواز سن کر وہ باہر کی طرف لپکی۔سارا سامان کار میں رکھا جا چکا تھا۔سامان بھی کافی ہو گیا تھا۔سب کے لیے تحفے تحائف،عید کے کپڑے اور بھی کئی طرح کی چیزیں۔

کار آگے کی طرف چل پڑی اور اس کا ذہن پیچھے کی طرف دوڑ لگانے لگا۔اس کا گاؤں گرچہ چھوٹا سا تھا لیکن وہاں ہر جانب چہل پہل لگی رہتی تھی۔گلیاں ہر وقت گلزار رہا کرتیں۔خاص طور پر رمضان کے مہینے کی تو بات ہی اور تھی۔جب وہ چھوٹی سی تھی۔آج کی طرح رمضان گرمیوں میں آیا کرتا تھا۔دن بھر لو چلتی لیکن اس موسم میں بھی لوگ روزہ رکھتے اور اپنے اپنے کام میں مشغول رہتے۔ابا اکثر افطار پارٹی کرتے۔گاؤں کے سبھی لوگ ہاتھ بٹانے کے لیے آجاتے۔ابا کے جتنے جاننے والے تھے سبھی کو مدعو کیا جاتا۔بلاک، تھانہ، اسکول اور کالج..... ہر جگہ سے لوگ آتے۔شاندار افطار پارٹی ہوتی۔بہت دنوں تک اس کا چرچہ رہتا۔ اس وقت میٹھے پانی کے لئے ایک یا دو چاپانل تھے۔کچھ گھروں میں کوئیں کا پانی میٹھا ہوا کرتا تھا۔ان کنوؤں پر لوگوں کا ہجوم لگا رہتا۔لوگ کپڑا بھینگا بھینگا کر منہ پر لپیٹتے تا کہ ٹھنڈک محسوس ہو۔ان دنوں گاؤں میں بجلی نہیں آئی تھی۔مغرب سے کچھ دیر پہلے ایک آئسکریم والا آئسکریم لے کر آجاتا۔لوگ ٹوٹ پڑتے۔اذان ہوتے ہی لوگ روزہ کھولتے۔اس کے گھر میں ایک بڑا سا آنگن تھا جس میں چار چوکیوں کو جوڑ کر اس پر چادر بچھا دی جاتی اور پھر اس پر دسترخوان بچھا کر افطاری سجا دی جاتی۔افطاری میں بہت سارے آئیٹم ہوتے، گھر کے بچے بوڑھے جوان سبھی ایک ساتھ مل کر افطاری کرتے۔عورتوں کے لیے الگ دسترخوان بچھتا۔

جیسے جیسے عید کا وقت قریب آتا شہروں میں کام کرنے والے سبھی لوگ اپنے گھر

آجاتے۔گاؤں میں چہل پہل بڑھ جاتی۔عید کی خریداری اور تیاری بھی جم کر ہوتی۔ضرورت کی ہر چیز خریدی جاتی۔وہ سب سے بڑی تھی گھر کی چاندرات وہ سب کے کپڑے الگ الگ سینی پر سجا کر رکھتی کہ صبح آسانی ہوگی۔پوری رات صبح کے انتظار میں گزر جاتی۔عید کے دن کیا رونقیں ہوتی تھیں۔ایسا لگتا جیسے کسی کی شادی ہے۔اس روز سب سے پہلے دودھ اور چھوہارہ کھانے کا رواج تھا۔اماں رات میں ہی چھوہارے پھلا دیتی تھیں۔چھوہارا دودھ کے ساتھ سوئیاں اور چھولے کھانے کے بعد تیار ہو کر سب سہیلیوں کے ساتھ گھومنا کتنا اچھا لگتا تھا۔ساری سہیلیاں ایک دوسرے سے گلے مل کر ایک دوسرے کو مبارکباد دیتیں۔سارا دن اسی طرح گزر جاتا۔

وقت چلتا رہتا ہے مگر اس کے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دیتی۔کب چھوٹے پودے بڑے ہو گئے، کب ان میں پھول اور پھل لگ گئے اور کب وہ جوان ہو گئی، پتہ ہی نہ چلا۔ایک ایک کر کے اس کی سہیلیوں کی شادی ہوتی گئی۔اس کی ایک سہیلی تھی گڑیا۔اس کی شادی ذرا جلد ہو گئی تھی۔شادی کے بعد اس کا شوہر سعودیہ چلا گیا تھا۔عید آئی مگر وہ نہ آیا۔گڑیا کا مزاج شاعرانہ تھا۔عید کے روز وہ نازو کو اشعار سناتی:

عید آئی تم نہ آئے پھر مزہ کیا عید کا
عید ہی تو نام ہے اک دوسرے کی دید کا

کبھی کہتی:

عید کے دن بھی تقدیر سے مجبور تھے ہم
رو پڑے مل کر گلے تیری تصویر سے ہم

نازو اسے گلے لگاتی اور یہ کہہ کر دلاسہ دیتی کہ ان شاء اللہ اگلے سال اس کا دلبر اس کے ساتھ ہوگا۔

کچھ عرصہ بعد اس کی بھی شادی ہوگئی اور وہ گاؤں سے شہر آ گئی۔ جب تک والدین زندہ رہے وہ اکثر ان سے ملنے آتی لیکن اب ابّا رہے نہ امّی۔ بھائیوں کی بھی شادی ہوگئی۔ لیکن وہ گاؤں میں ہی زمین جائداد سنبھالنے کے لیے رہ گئے۔

پھر بہت ساری بہاریں آئیں اور گئیں۔ اور اب جبکہ چہرے پر گزرتے وقت کی لکیریں اُبھرنے لگی تھیں وہ ایک بار پھر اپنے میکے جا رہی تھی۔ کار اسپیڈ میں چل رہی تھی۔ دھیرے دھیرے اس کا گاؤں قریب آتا گیا۔ راستوں کو دیکھ کر ناز کو ایسا لگنے لگا جیسے کار کسی انجان منزل کی جانب رواں ہے۔ نظر کے سامنے ٹوٹی پھوٹی اور گرد آلود سڑک کی جگہ چمچماتی ہوئی شاہراہ تھی۔ کار کچھ اور آگے بڑھی تو کچے مکانوں کی جگہ نئے اور خوبصورت مکانات نظر آنے لگے۔ اور جب کار گاؤں کے حدود میں داخل ہوئی تو اس کی حیرت دو چند ہو گئی۔ سڑکیں تو گاؤں کی بھی پکّی ہوگئی تھیں لیکن وہاں ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی چہل پہل نہیں۔ مئی کا مہینہ تھا اور دو پہر کا وقت۔ ہر شخص اپنے گھر میں دُبکا پڑا تھا۔ کئی گھروں کی دیوار پر ائیر کنڈیشن کا آؤٹر بھی دکھائی دیا۔ یہ سب دیکھ کر ناز و حیرت زدہ تھی۔ وقت کے ساتھ گاؤں بھی بدل گیا تھا اور گاؤں والے بھی۔

گھر پہنچی تو بھائیوں، بھابیوں اور بھتیجے بھتیجیوں نے زبردست استقبال کیا۔ یہ دیکھ کر اس کی ڈھارس بندھی کہ اس کہ گھر والے نہیں بدلے ہیں۔

دوسرے روز عید تھی۔ مرد تو عید کی نماز پڑھنے چلے گئے اور عورتیں گھر کے کاموں میں لگ گئیں۔ پھر سب تیار ہو کر مہمانوں کا انتظار کرنے لگیں لیکن دو تین لوگوں کو چھوڑ کر کوئی ملنے نہیں آیا۔ اس کی سہیلیاں تو خیر اپنے اپنے سسرال میں تھیں لیکن جو گاؤں کی پرانی ملنے والیاں تھیں انہوں نے بھی جھانکی نہیں ماری۔ اس نے وجہ پوچھی تو بھابھی کہنے لگیں کہ جن کی دادی

اور نانی یہاں اس انتظار میں بیٹھی رہتی تھیں کہ کچھ کھانے کو مل جائے گا وہ سب آج صاحب حیثیت ہو گئے ہیں۔ شہر کی ساری سہولتیں یہاں میسر ہیں۔ ہر گھر میں بجلی کا کنکشن ہے۔ بہت سارے گھروں میں ٹی وی، فریج، واشنگ مشین اور اے سی بھی موجود ہے۔ سڑکیں پکّی ہوگئیں تو شہر سے گاؤں کی دوری کم ہوگئی مگر شہری سہولیات کی وجہ سے دلوں کی دوریاں بڑھ گئی ہیں۔

بھابھی کی باتیں سن کر اس کے جذبات پر گویا اوس پڑ گئی۔ گاؤں آنے کی ساری خوشی کافور ہوگئی اور اس کے دل سے بے ساختہ آواز نکلی۔

کوئی لوٹا دے مرے بیتے ہوئے دن۔

◂◂ ● ▸▸

شبانہ

سرو سا قد، کالے گھنے لمبے بال، ہرنی جیسی آنکھیں، ہرنی جیسی مسکراتی، کچھ کہتی آنکھیں اور سانولا رنگ۔ وہ میرے بچپن کی سہیلی شبانہ تھی۔لیکن یہ بیتے دنوں کی بات ہے۔ صرف چند مہینوں میں ہی اس کی کایا بالکل بدل گئی تھی۔ بالوں میں جیسے گرد سی بیٹھ گئی تھی اور ہر وقت مسکراتی آنکھوں کی روشنی بجھ گئی تھی۔پچھلے کئی مہینوں سے وہ بیڈ پر پڑی ہے، پورا جسم زخموں سے چور ہے۔دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے۔پیروں کی ہڈیاں چور چور ہوگئیں۔سر پر بھی گہرا زخم لگا اور نہ جانے کتنے ٹانکے پڑے ہوں گے۔آئے دن مختلف قسم کے آپریشن ہو رہے ہیں۔کبھی اس ہسپتال میں تو کبھی اس ہسپتال میں۔میں جس وقت اسے دیکھنے پہنچی تو وہ آنکھیں بند کیے بستر پر پڑی تھی۔اس کی یہ حالت دیکھ کر میرے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی اور میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکلنے لگے۔میں نے رندھی ہوئی آواز میں اسے پکارا تو اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔وہ اُٹھ کر مجھ سے گلے ملنا چاہتی تھی لیکن مجبور تھی۔میں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور پھر ہم دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کی اولاد تھی۔باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔سات بھائیوں میں وہ اکیلی بہن تھی اور سب سے بڑی تھی۔چونکہ خوش مزاج تھی لہذا پورے گاؤں کی پیاری تھی۔ بڑی ہوئی تو اس کے لیے اچھے گھرانوں سے رشتے آنے لگے۔لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ رشتے آسمانوں میں بنتے ہیں تو اس کے گھر والوں نے کئی اچھے رشتوں کو ٹھکرا کر ایک ایسے شخص سے اس کی شادی کر دی جو کسی طور پر بھی اسے پسند نہیں آیا۔

بھائی لوگ شاید لڑکے کے مال و دولت سے متاثر ہو گئے تھے۔اس کا اچھا خاصا بزنس تھا۔شادی بہت شاندار طریقے سے ہوئی۔ پورے گاؤں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔شبانہ بھی خوش تھی لیکن جب اس نے اپنے شوہر کو دیکھا تو اس کی ساری خوشی کافور ہوگئی۔اس کے شوہر کی عمر کچھ زیادہ تھی۔ رنگ بھی پکّا تھا اور پیٹ بھی کچھ آگے کو نکلا ہوا تھا۔شادی کے بعد اسے مشترکہ خاندان میں رہنا پڑ رہا تھا جہاں سب کچھ سانجھا تھا۔اسے سبھوں سے شکایت تھی.....ساس ،نندیں ،جیٹھانی، دیورانی .....سبھوں سے اسے شکایت تھی۔لیکن عورت تو عورت ہی ہوتی ہے۔اسے جس سانچے میں ڈھالو وہ ویسی ہی بن جاتی۔اور جو سماج کے بنائے ہوئے اس سانچے میں فِٹ نہیں بیٹھتی ہیں، سماج انہیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔شبانہ کا شوہر خواہ جیسا بھی تھا وہ اس کا مجازی خدا تھا اور خدا نے کہا ہے کہ میرے بعد اگر کسی کا سجدہ جائز ہوتا تو وہ شوہر تھا۔اور ویسے بھی وہ مزاج کا اچھا تھا۔اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک سادہ سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔یہ سب کچھ تھا لیکن دل کے کسی کونے میں ایک کانٹا سا کھٹکتا تھا کہ کاش میرے بھائیوں نے کچھ اور سوچا ہوتا۔میری شادی کہیں اور ہوئی ہوتی۔

بائیس سال گزر گئے۔تین بچے ہوئے۔ایک بیٹی اور دو بیٹے۔بیٹی اب سیانی ہو چکی تھی اور شبانہ جلد از جلد اس کے ہاتھ کے ہاتھ پیلے کر دینا چاہتی تھی لیکن اس کے شوہر کا اس طرف دھیان ہی نہیں تھا۔وہ اپنے آپ میں مگن رہتا۔اپنے کام پر پورا دھیان دیتا۔بچوں کے ساتھ بالکل بچہ بن جاتا۔فرصت کے اوقات میں موبائل پر گیم کھیلتا رہتا۔وہ بگڑتی تو جواب ملتا کہ اس کی شادی تم کرو گی، میں کیا کروں گا۔اسے کیا معلوم تھا کہ کبھی کبھی زبان سے نکلی ہوئی کوئی بات آسمانوں تک پہنچ جاتی ہے۔

شبانہ ان دنوں کافی مصروف تھی۔اس کے سسرال میں کسی کی شادی تھی۔تیاریاں زور و

شور سے چل رہی تھیں اور وہ بھی ان کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ چونکہ کچھ عرصہ قبل ہی اس کی ساس کا انتقال ہو گیا تھا لہذا اس کی ذمہ داریاں بڑھ گئی تھیں۔ شہر اس کے گاؤں سے قریب تھا اور وہ تقریباً روز ہی اپنے شوہر کے ساتھ موٹر سائکل پر بیٹھ کر خریداری کرنے کے لیے جا رہی تھی۔ ایک روز بازار میں ہی شام ہو گئی اور گھر لوٹتے لوٹتے رات اُتر آئی تھی۔ شہر کی روشنیاں پیچھے چھوٹ گئی تھیں اور گاؤں اب چند میل کے فاصلے پر ہی رہ گیا تھا۔ سڑک کی دونوں جانب کھیت تھے جن میں دھان کی فصل لہلہا رہی تھی۔ ہوا بھی سرد ہو چلی تھی۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی کہ اچانک نیل گائے کا ایک جھنڈ تیز رفتاری سے سڑک پر آ گیا۔ موٹر سائکل کا بیلنس بگڑ گیا اور دونوں میاں بیوی زمین پر گر پڑے۔ اسی اثنا میں ایک نیل گائے کا پیر شبانہ کے شوہر کے سر پر پڑا اور پھر سب کچھ ختم ہو گیا۔ اِدھر کئی جانور شبانہ کے اوپر سے بھی گزر گئے۔ اس کے بدن میں درد کی ایک تیز لہر پھیلتی چلی گئی اور چند ہی ثانیوں میں وہ بے ہوشی کے گہرے سمندر میں اُترتی چلی گئی۔ اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ہسپتال کے بیڈ پر پایا۔ اس کا سارا جسم پٹیوں سے ڈھکا تھا اور سر میں ناقابل برداشت تکلیف ہو رہی تھی۔ اس حالت میں بھی اسے سب سے پہلا خیال اپنے شوہر کا آیا۔ پتہ نہیں وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ اس نے اپنی آنکھیں چاروں طرف گھمائیں۔ کمرے میں اسے صرف ایک نرس نظر آئی۔ اسے ہوش میں آتا دیکھ کر اس نے ڈاکٹر کو خبر دی اور پھر تھوڑی ہی دیر میں اس کے بچے اور اس کے سامنے کھڑے تھے۔ رو رو کر سب کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ وہ ان سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن اس وقت نہ تو وہ بولنے کے لائق تھی اور نہ ہی اس کے بچے کچھ بتانے کو تیار تھے۔ وہ اسے کیسے بتاتے کہ وہ اب یتیم ہو چکے ہیں اور ان کے سر سے ایک گھنے پیڑ کا سایہ اُٹھ چکا ہے۔

چند روز اور گزر گئے۔ اس کا علاج چلتا رہا۔ جب اس کی حالت کچھ سنبھلی تو اس نے

اپنے شوہر کے بارے میں سوالات کرنے شروع کر دیے اور ہر بار اسے ایک ہی جواب ملتا کہ ان کا علاج دوسرے ہسپتال میں ہو رہا ہے۔ وہ کہتی کہ ان کی تصویر دکھا دو یا ویڈیو بنا کر لاؤ۔ بچے کہتے کہ ڈاکٹر اس کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ سچائی اس سے کئی روز تک چھپائی گئی لیکن حقیقت سات پردوں سے بھی باہر آ کر ہی رہتی ہے۔ اور ایک دن وہ اس جان لیوا حقیقت سے واقف ہو گئی کہ اب اس کا شوہر اس دنیا میں نہیں رہا۔ اس کا سہاگ ختم چکا ہے۔ وہ بیوہ ہو گئی ہے۔ اس کا ہنستا کھیلتا گھر اُجڑ چکا ہے اور اب اسے زندگی کے باقی دن ایسے ہی گزارنے ہوں گے۔ وہ خدا سے شکایت کرنا چاہتی تھی لیکن یہ سوچ کر رُک جاتی کہ خدا کو اس کی بات پسند نہ آئے اور وہ اسے مزید آزمائشوں میں ڈال دے۔ اس میں اب اور صدمے برداشت کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ لیکن اب ایک بات کا اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس کا شوہر جو بھی تھا، جیسا بھی تھا صرف اس کا تھا۔

◂◂ ● ▸▸

کرچیاں

شبنم آجکل اپنے میکے آئی ہوئی تھی۔ میکہ بھی کتنا پیارا لفظ ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن اور بہت ساری سہیلیاں۔ بچپن کی یادیں..... بچپن کی باتیں..... فکر وغم سے آزاد ہنستے، مسکراتے حسین لمحے۔ ایک روز وہ کسی کام سے بازار گئی تو راہ چلتے اس کی ملاقات غزالہ سے ہوگئی۔

''ارے شبنم! کب آئیں۔'' غزالہ اسے دیکھ کر چہک اُٹھی۔ شبنم نے دامن بچانا چاہا لیکن غزالہ اس سے لپٹ گئی۔ اس کی محبت بھری ادا نے شبنم کو پگھلا دیا اور اس نے بھی گرم جوشی کا مظاہرہ کرنا شروع کیا۔ دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ اسکول سے لے کر کالج تک کی تعلیم دونوں نے ساتھ ساتھ ہی حاصل کی تھی۔ لیکن شادی ہو جانے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوگئی تھیں۔ شبنم اپنے سسرال گئی اور غزالہ اپنے۔ دونوں سہیلیاں ملیں تو پھر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ شکوے شکایت بھی ہوئے۔ جاتے جاتے غزالہ نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی جسے شبنم نے خوش دلی کے ساتھ قبول فرمالیا۔

شبنم گھر آئی تو اس نے اپنی امی کو غزالہ سے ملاقات کا واقعہ بتایا اور یہ بھی کہا کہ اس نے اسے اپنے گھر بلایا ہے۔ غزالہ کا تذکرہ سن کر اس کی امی کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ کہنے لگیں کہ تم تو جانتی ہی ہو کہ غزالہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔ تم اس کے گھر نہ ہی جاؤ تو بہتر ہے۔ امی کی بات سن کر شبنم کو پرانی باتیں یاد آنے لگیں۔ غزالہ نہایت آزاد خیال لڑکی تھی۔ نئے نئے فیشن کے کپڑے پہننا، ہیئر اسٹائل بنانا، نئے نئے لڑکوں سے دوستی کرنا، ان کے ساتھ گھومنا پھرنا، سنیما دیکھنا اور ہوٹلوں میں تفریح کرنا اس کا مشغلہ بن گیا تھا۔ شریف لڑکیوں نے اس سے

دوری بنالی تھی اور اتنا ہی نہیں خود اس کے والدین بھی اس کی ان حرکتوں سے پریشان تھے اور اسے ہر وقت روکتے ٹوکتے رہتے تھے لیکن غزالہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا اور بدستور اپنے راستے پر چلتی رہی۔

ایک دفعہ وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ غائب ہوگئی۔ شہر میں کافی بدنامی ہوئی اور اس کے گھر والے منھ چھپا کر بیٹھ گئے۔ لیکن جس طرح وہ غائب ہوئی تھی اسی طرح ایک روز واپس بھی آ گئی۔ اس کے گھر والوں نے اسے گھر سے نکالا تو نہیں مگر اس سے لاتعلق ہو کر رہ گئے۔ مگر غزالہ کو اس کی پروا کب تھی۔ اب تو وہ اپنی مالک خود بن گئی تھی۔ جو جی میں آتا کرتی۔ اب تو لوگوں نے اسے ٹوکنا بھی بند کر دیا تھا۔ وہ کئی دفعہ گھر سے غائب ہوئی اور پھر واپس چلی آئی۔ پھر معلوم ہوا کہ اس نے اپنے کسی دوست کے ساتھ شادی کر لی ہے اور دوسرے شہر میں رہنے لگی۔ شبنم سے اس کا رابطہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔

شبنم کی تعلیم ختم ہو چکی تھی اور اب اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر تھی۔ جلد ہی ایک مناسب رشتہ آ گیا۔ جاوید اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنا بزنس تھا اور خوشحال تھا۔ شبنم کے گھر والوں کو یہ رشتہ پسند آ گیا اور دونوں کی جلد ہی شادی ہوگئی۔ شبنم اپنے سسرال آ کر بہت خوش تھی۔ جاوید ایک اچھا شوہر ثابت ہوا تھا اور وہ اس کا پورا خیال رکھتا تھا لیکن بزنس ٹور کی وجہ سے وہ مہینے میں پندرہ دن گھر سے باہر رہا کرتا تھا۔ اس کے گھر والے بھی نیک اور مہربان تھے۔ شبنم کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ تھی۔ شادی کے ایک سال بعد ہی شبنم ایک پیارے سے بیٹے کی ماں بن گئی۔ اسے اب اپنی زندگی مکمل لگنے لگی تھی۔

ایک طویل عرصے کے بعد آج جب غزالہ سے ملاقات ہوئی تو دل میں اس کے لیے محبت سی پیدا ہوگئی اور اس کے گھر جانے کو دل مچلنے لگا۔ لیکن امی کی اجازت کے بغیر شبنم یہ قدم

نہیں اُٹھا سکتی تھی لہذا اس نے ان کی خوشامد کرنی شروع کی اور کہا کہ غزالہ اب شادی شدہ ہے اور اس نے اپنی پرانی روِش بدل دی ہے۔ آخر کار امی نے اجازت دے دی اور شبنم ایک روز اس کے گھر جا پہنچی۔ غزالہ اسے دیکھ کر کِھل اُٹھی۔ اس کے گھر والوں نے بھی اس کا پُر جوش خیر قدم کیا۔ وہ بھی وہاں پہنچ کر بہت خوش تھی۔ پھر غزالہ اسے اپنے کمرے میں لے گئی اور دونوں باتیں کرنے لگیں۔

''اچھا یہ بتاؤ، تمہارے ہسبینڈ کیسے ہیں؟'' شبنم کا سوال سن کر غزالہ کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے کہا۔

''ابھی تو وہ یہاں نہیں ہیں ورنہ میں تمہیں ان سے ملواتی۔ اچھا ٹھہرو، میں تمہیں ان کی تصویر دکھاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر غزالہ اُٹھی اور سنگار میز پر رکھی ایک تصویر اُٹھا کر لانے لگی لیکن نہ جانے کیسے وہ مسہری کے کونے سے ٹکرا گئی اور شیشے کے فریم میں لگی وہ تصویر زمین پر گر گئی۔ ایک چھناکے کی آواز آئی اور شیشے کی کرچیاں دور تک پھیل گئیں۔ شبنم نے ان کرچیوں کو اپنی آنکھوں میں چبھتا ہوا محسوس کیا۔ فریم سے آزاد اس کے شوہر جاوید کی تصویر زمین پر پڑی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔

◀◀ ● ▶▶

ماں

اُنہوں نے دھیرے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بار..... دو بار..... لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر انہوں نے ہاتھوں سے ہلکا سا دباؤ ڈالا تو دروازہ کھل گیا۔

''اُٹھو بیٹا! چائے پی لو۔'' اکرم چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ پہلے تو اس نے بغل میں سوئی ہوئی اپنی بیوی پر ایک نظر ڈالی اور پر غضبناک نگاہوں سے ماں کو دیکھتے ہوئے گرجا۔

''ماں! تجھے ذرا شرم نہیں آتی؟ آنے سے پہلے دروازہ تو کھٹ کھٹا لیا کرو۔''

''معاف کردو بیٹا۔ غلطی ہوگئی۔ آئندہ سے ایسا نہیں ہوگا۔'' فہمیدہ بی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا اُنہوں نے چائے تپائی پر رکھی اور کچن میں جا کر کام میں مصروف ہوگئیں۔ گھر کا سارا کام انہی کے ذمہ تھا۔ صبح کی چائے سے لے کر رات کا کھانا بنانے اور پوتے فرحان کا ٹفن تیار کر کے اسے اسکول بھیجنے تک کی ذمہ داری انہی کی تھی۔ اُن کا کام صرف کھانا پکانا ہی نہیں تھا بلکہ وقت پر ٹیبل پر لگا بھی دینا تھا۔ لیکن اس کا صلہ دن رات کی جھڑکیوں اور گھڑکیوں کی صورت میں ملتا۔ ایک روز اکرام نے پوچھا۔

''ماں! میں نے تمہیں کل ایک پرچی دی تھی وہ کہاں ہے؟

''بیٹا! تم نے تو مجھے کوئی پرچی نہیں دی تھی۔'' اتنا سننا تھا کہ اکرام کا پارہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا اور وہ زور زور سے چلانے لگا۔

''ماں! اب تم بوڑھی ہوگئی ہو، سٹھیا گئی ہو۔ اب تمہارا دماغ کام نہیں کرتا ہے۔ ایک پرچی بھی سنبھال کر نہیں رکھ سکتیں۔'' اکرام اپنی ماں کو ابھی کھری کھری سنا ہی رہا تھا کہ اس کا

دس سالہ بیٹا فرحان اپنے ہاتھوں میں وہی پرچی لیے ہوئے آیا اور بولا۔

''پاپا! یہ پرچی آپ نے مجھے دی تھی۔'' اکرام کھسیا گیا لیکن شرمندہ ہونے کے بجائے منھ بچکاتے ہوئے چلا گیا۔

اُن کا دل اندر سے رو رہا تھا مگر آنکھیں خشک تھیں۔ بیٹے کی بات نے ان کے دل کو چھید کر رکھ دیا تھا۔ حالانکہ ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ بیٹے اور بہو کی جھڑکیاں تو اُن کا مقدر بن گئی تھیں۔ وہ ایک عورت اور ایک ماں تھیں۔ عورت کا دل تو ویسے ہی نازک ہوتا ہے۔ لیکن ہر عورت ایسی نہیں ہوتی۔ کچھ پتھر دل بھی ہوتی ہیں۔ ایک دفعہ ایک عورت نے اپنے شوہر سے یہ فرمائش کی کہ وہ اپنی ماں کا دل نکال کر اس کے قدموں میں رکھ دے۔ وہ بد بخت اپنی بیوی کی محبت میں اس قدر اندھا ہو چکا تھا کہ وہ فوراً اس کے حکم کی تعمیل کے لیے گھر سے نکل پڑا اور ماں کے پاس پہنچ کر بولا کہ ماں! مجھے تیرا دل چاہئے۔ اب ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ نو مہینے تک پیٹ میں رکھنے کے بعد وہ اپنے بچے کو جنم دیتی ہے اور پھر اسے پالنے پوسنے میں طرح طرح کی صعوبتیں اور پریشانیاں اُٹھاتی ہے۔ رات کی نیند، دن کا چین سکون سب تج دیتی ہے لیکن اُف تک نہیں کرتی۔ وہ اپنے بچے کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کرتی رہتی ہے۔ اب جب اس شخص نے اپنی ماں سے اس کا دل مانگا تو وہ کیسے انکار کر سکتی تھی۔ اس نے فوراً کہا۔

''نکال لے بیٹا میرا دل میرے سینے سے اور دے آ اپنی بیوی کو۔'' بیٹے نے خوشی خوشی ماں کا سینہ چیرا اور اس کا دل نکال کر شاداں و فرحاں تیز تیز قدموں سے اپنی منزل مقصود کو چلا۔ راستے میں اُسے ٹھوکر لگی۔ وہ زمین پر گر گیا۔ فوراً ماں کے دل سے آواز آئی۔

''بیٹا! تجھے چوٹ تو نہیں لگی؟''

اکرام نے بھی ایک دن ایک فرمائش کر ڈالی۔

''ماں! ایک فلیٹ جو تمہارے نام ہے اور جسے تم نے کرائے پر لگا رکھا اسے میرے نام لکھ دو۔ اب ہم لوگ وہیں جا کر رہیں گے۔''

فہمیدہ بی حیران ہو گئیں۔

کیوں بیٹا، آخر اس گھر میں کیا خرابی ہے؟ ہم لوگ وہاں کیوں جا کر رہیں گے؟''

''ہم لوگ نہیں ماں، صرف میں اور بیوی وہاں جا کر رہیں گے۔ تم یہیں رہنا اپنے پرانے مکان میں۔'' فہمیدہ بی پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ اکرام یہ کیا کہہ رہا ہے۔ اسے اتنا بھی خیال نہیں آیا کہ میں بیمار اور بوڑھی عورت یہاں اکیلی کیسے رہوں گی۔ انہوں نے آنکھوں میں اُمڈ آئے آنسوؤں کو روکتے ہوتے بھاری دل سے کہا۔

''بیٹا! بس دو مہینے رک جاؤ پھر جہاں جی چاہے چلے جانا۔''

''کیوں ماں، دو مہینے بعد کیوں؟ ابھی کیوں نہیں؟''

''میں کچھ کام رہی ہوں۔ ابھی اس سلسلے میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ وقت آنے پر تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

فہمیدہ بی روز رات کو سارے کاموں سے فارغ ہو کر ایک ڈائری لکھا کرتی تھیں۔ کسی کو نہیں پتہ تھا کہ اس ڈائری میں کیا کیا لکھا ہوا ہے۔ یہ ڈائری ان کی سہیلی اور تنہائی کی ساتھی تھی۔ وہ اپنی لکھی ہوئی تحریر پڑھتیں۔ کبھی ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ جاتی اور کبھی غم کی لکیریں اُبھر آتیں۔

ایک روز دن چڑھے تک فہمیدہ بی بیدار نہیں ہوئیں۔ اکرام چائے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کی بیوی بھی اُٹھ چکی تھی اور منہ ہی منہ میں بُدبُدا رہی تھی۔

''پتہ نہیں بُڑھیا کہاں مر گئی۔ کہتی تھی کہ دو مہینے بعد فلیٹ اکرام کے نام لکھ دوں

گی۔ دو مہینے پورے بھی ہو گئے اور ابھی تک ٹال مٹول ہی کر رہی ہے۔'' پھر وہ کمرے سے باہر نکلی اور وہیں سے چلا کر بولی۔

''اکرام! دیکھئے! آپ کی امّاں ابھی تک سوئی پڑی ہیں۔ ناشتہ تک نہیں بنایا ہے۔ آپ کو آفس جانا ہے۔ مُنے کو اسکول بھی جانا ہے۔ گھر میں جھاڑو تک نہیں ہوا ہے۔''

اکرام کو کچھ شبہہ سا ہوا۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا ماں کے کمرے میں پہنچا۔ فہمیدہ بی صوفے پر چت پڑی تھیں۔ اکرام نے انہیں ہلا ڈُلا کر دیکھا مگر وہاں تو صرف ایک بے جان جسم پڑا تھا۔ پاس کی میز پر ڈائری پڑی ہوئی تھی۔ اکرام نے کانپتے ہاتھوں سے ڈائری اُٹھا کر دیکھا۔ آخری صفحے پر لکھا تھا۔

''لگتا ہے کہ آج میری زندگی کی آخری رات ہے۔ ڈاکٹر نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میرا کینسر اب اپنے آخری اسٹیج میں ہے اور میں دو مہینے سے زیادہ نہیں جی پاؤں گی۔ اکرام نئے فلیٹ کے لیے ضد کر رہا ہے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری زندگی میں وہ مجھ سے الگ ہو۔ اب وہ آزاد ہے اور میرا جو کچھ بھی ہے وہ اس کا قانونی وارث ہے۔''

اکرام کے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔ آج اسے ماں کی عظمت اور اہمیت کا احساس ہوا اور وہ سسکتے ہوئے بول اُٹھا۔

''نہیں ماں! ہم لوگ کہیں نہیں جائیں گے۔ یہیں رہیں گے تمہارے ساتھ..... تمہارے ساتھ۔''

◀◀ ● ▶▶

پیار

پیار ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو کمزور کر دیتا ہے۔ اسے بے بس اور مجبور کر دیتا ہے۔ جب انسان کسی کے پیار میں دیوانہ ہو جاتا ہے تو اسے کسی کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا۔ اسے اچھے برے اور صحیح غلط کی تمیز نہیں ہوتی۔ وہ اپنے آپا کھو بیٹھتا ہے۔ پھر اسے اپنا خیال رہتا ہے نہ اپنے گھر والوں کا۔ اسے کسی بات کی فکر نہیں رہتی۔ اسے بس ایک ہی فکر ستاتی ہے کہ وہ جس سے پیار کرتا ہے وہ اس کا ہو جائے۔ اور پھر وہ اسے پانے کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ اور یہی سب کچھ ہوا صنوبر کے بیٹے شاہد کے ساتھ۔ اس کا شوہر حامد کسی دفتر میں تیسرے درجے کا ملازم تھا۔ آدمی ایماندار تھا لہذا بالائی آمدنی سے گریز کرتا تھا۔ شاہد کے بعد تین بیٹیاں اور تھیں۔ لیکن صنوبر کا سارا دھیان بیٹے پر ہی تھا۔ اس نے کیا کیا جتن نہیں کیے اسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانے کے لیے۔ شوہر کی کم آمدنی کے باوجود اس نے پیسے بچا بچا کر اسے پڑھایا لکھایا۔ انٹر کرنے کے بعد اس کا داخلہ بنگلور کے ایک انجینئرنگ کالج میں کروا دیا اور اس کا خرچ پورا کرنے کے لئے خود بھی کپڑے سینے کا کام شروع کر دیا۔ کپڑے سیتے سیتے اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے مگر انہی آنکھوں میں مستقبل کے سنہرے خواب بھی سجنے لگے۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جب اس کا بیٹا پڑھ لکھ کر برسر روزگار ہو گیا تو اسے کسی امیر زادی سے عشق ہو گیا۔ اس کا نام شادماں تھا۔ اس کی نظر میں زندگی کا مقصد صرف عیش کرنا تھا۔ اس امیر زادی کے شوق بھی بڑے مہنگے تھے۔ شاہد اپنی ساری تنخواہ اس کے شوق پورے کرنے میں اُڑا دیتا اور اس کے والدین تہی دامن ہی رہ گئے۔ اس عرصے میں حامد بھی

ملازمت سے سبک دوش ہو چکا تھا۔ اب صرف پنشن پر گزارا تھا۔ گھر کی مالی حالت اور خراب ہوگئی۔ مگر شاہد ان باتوں سے بے پروا عشق کے گھوڑے پر سوار خیالوں کی دنیا میں اُڑا جا رہا تھا۔ اسے اپنے والدین کا خیال تھا نہ بہنوں کی فکر۔

صنوبر اب زیادہ تر بیمار رہنے لگی تھی۔ اس سے اب سِلائی کا کام بھی نہیں ہو پاتا تھا۔ بیٹے کو فون کرتی تو وہ زیادہ بات نہیں کرتا۔ اسے ہر وقت اسی کی فکر لگی رہتی۔ پتہ نہیں کیسے رہتا ہے، کہاں کھاتا ہے؟ ہوٹل کا کھانا کھا کر کہیں بیمار نہ پڑ جائے۔ اب وہ جلد از جلد اس کی شادی کر دینا چاہتی تھی لیکن پھر بیٹیوں کا خیال آ جاتا۔ پہلے ان کی شادی ہو جاتی تو بہتر تھا۔ وہ ہر نماز میں دعائیں مانگتی لیکن اس کی ہر دعا آسمان سے پلٹ آتی۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ مایوسی کفر ہے۔

اُدھر شاہد کے لیے ہر دن عید اور ہر رات شب براءت تھی۔ راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے لیکن عیش و عشرت کے روز و شب اسے پھیکے لگتے۔ اب وہ شادماں سے شادی کر کے اسے ہمیشہ ہمیش کے لیے اپنا بنانا چاہتا ہے۔ اور اس مقصد کے لیے اس نے اپنے گھر کا سفر اختیار کیا۔ ایک طویل عرصے کے بعد جب اس کے والدین نے اسے اپنے سامنے دیکھا تو خوشی کے مارے ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ بہنیں بھی فرط جذبات میں رو پڑیں۔ لیکن جب اس نے اپنے آنے کا مقصد بتایا تو سبھوں کے سر پر گویا بجلی سی گر پڑی۔ ماں باپ اور بہنیں سبھوں کو چُپ سی لگ گئی۔ شاہد شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایک ایسی لڑکی سے جسے ان لوگوں نے دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ لوگ اسے روک بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جوانی بے لگام ہوتی ہے اور پیار اندھا ہوتا ہے۔ بھاری دل سے ماں نے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا! جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن ہم لوگ تمہارے سر پر سہرا بندھا ہوا دیکھنا

چاہتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم خود سے شادی کر لو اور ہمارے دل کے ارمان دل ہی میں رہ جائیں۔ ہم لوگ تمہاری شادی کی تیاری کرتے ہیں۔ تم یہاں سے بارات لے کر جاؤ گے اور دلہن کو رخصت کرا کے پہلے یہاں آؤ گے۔ اس کے بعد پھر جہاں مرضی ہو جا کر بس جانا۔''

شاہد کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ویسے وہ چاہتا تو بغیر اپنے گھر والوں کو اطلاع دیے بھی یہ کام کر سکتا تھا لیکن شاید تھوڑی بہت تمیز اس کے اندر باقی تھی۔ وہ دوسرے ہی روز واپس ہو گیا۔ وہ جلد از جلد شادماں کو یہ خوش خبری سنانا چاہتا تھا۔ اس نے فون پر یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ لیکن جب وہ شادماں کے پاس پہنچا اور اسے یہ بتایا کہ اس کے والدین اس کی شادی کے لیے راضی ہوگئی ہیں تو پہلے تو وہ بھونچکی ہو کر اسے دیکھتی رہی، پھر دھیرے سے بولی۔

''شادی؟ کس کی شادی؟؟'' شاہد نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

''میری شادی، ہم دونوں کی شادی۔'' شادماں کچھ دیر تو حیران نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے چہرے پر حقارت کے جذبات اُبھر آئے۔

''شادی اور تم سے؟ تمہیں یہ خوش فہمی کیسے ہوگئی کہ میں تم سے شادی کروں گی۔ اپنی حیثیت دیکھی ہے کبھی۔ صرف انجینئر بن جانے اور پیسے کما لینے سے کوئی بڑا نہیں بن جاتا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم ایک نہایت غریب اور پسماندہ خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ میری فیملی اور تمہاری فیملی کا کوئی جوڑ نہیں۔'' شاہد پر تو جیسے بجلی سی گر پڑی۔ اسے اپنا دماغ ماؤف ہوتا محسوس ہوا۔ زبان گنگ ہوگئی اور پورے جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ اپنی ہمت یکجا کر کے وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''پھر وہ سب کیا تھا۔ وہ پیار محبت کی باتیں، وہ قسمیں وہ وعدے؟'' شادماں زور سے ہنس پڑی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔ شاہد اسے حیران نظروں سے دیکھتا رہا۔ شادماں نے

بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی اور کہنے لگی۔ ''ارے میرے بھولے راجا! وہ سب وقت گزاری کا مشغلہ تھا۔ ٹائم پاس۔ کیا سمجھے۔''

شاہد کا سر بہت زور سے چکرایا اور وہ ڈھرام سے زمین پر گر گیا۔ شاد ماں نے ایک مسکراتی نظر اس پر ڈالی اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔

◀◀ ● ▶▶

نئے راستوں کی تلاش

کل بارات آئے گی اور میں ایک ایسے آدمی کے سپرد کر دی جاؤں گی جسے میں جانتی ہوں نہ پہچانتی ہوں۔ کتنے بے رحم ہیں میرے والدین، میرے عزیز و اقارب ..... کسی کو بھی میری پروا نہیں۔ میری پسند، ناپسند، میرے جذبات و خیالات کی کسی کو پروا نہیں۔ میں جاہل اور گنوار نہیں ہوں۔ تعلیم یافتہ اور ہوش مند ہوں۔ اپنا اچھا برا سوچ سکتی ہوں۔ لیکن نہیں، یہ تو ازل سے ہوتا آ رہا ہے۔ لڑکیوں کو بے زبان سمجھ کر ان کی خواہش اور مرضی کے خلاف ان کی تقدیر کا، ان کی پوری زندگی کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

وہ روتی رہی اور سوچتی رہی۔

میں اس ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز بھی بلند نہیں کر سکتی۔ احتجاج بھی نہیں کر سکتی۔ ایسا کرنے پر خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ پھر اس نے سوچا کہ جب سارے لوگ خوش ہیں تو پھر وہ بھی ان کی خوشی کا حصہ بن جائے۔ سبھوں کی خوشی کی خاطر اپنی خوشی قربان کر دے۔ وہ بے بس اور مجبور سہی لیکن اپنے خاندان کے لیے اتنا تو کر ہی سکتی ہے۔ وہ ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے کبھی کسی سے پیار بھی نہیں کیا تھا۔ ایسا سوچتے ہوئے اسے اپنے بچپن کی یاد آ گئی اور وہ ماضی میں کھوتی چلی گئی۔ ابھی وہ محض بارہ سال ہی کی تھی کہ اس کی خالہ امی نے اسے اپنے بیٹے کے لیے پسند کر لیا۔ وہ اسے بہت پیار سے اپنے پاس بٹھاتیں اور خوب پیاری پیاری باتیں کرتیں۔ کہتیں کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ پھر وہ جب کسی سے اس کا تعارف کرواتیں تو کہتیں کہ یہ میری ہونے والی بہو ہے۔ دیکھو تو یہ کتنی اچھی ہے۔ میں نے تو

اس کے پیدا ہوتے ہی یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اسے اپنی بہو بناؤں گی۔ میں تو صرف اس انتظار میں ہوں کہ کب میرا بیٹا پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو اور کب میں اسے دلہن بنا کر اپنے گھر لے جاؤں۔ اس وقت وہ بہت چھوٹی تھی اور بہت ساری باتوں کا اسے کوئی علم نہیں تھا۔ وہ کم سخن بھی تھی اور اس کی سہیلیاں بھی بہت زیادہ نہیں تھیں۔ اس وقت اس کا سارا دھیان پڑھائی لکھائی کی طرف تھا۔ لیکن جب وہ کچھ اور بڑی ہوئی اور اسے شادی کا مطلب سمجھ میں آنے لگا تو اس وقت اس نے صرف اتنا چاہا کہ وقت پر اس کی شادی ہو جائے۔ لیکن جب اس کی خالہ جان باضابطہ اس کا رشتہ لے کر آئیں تو اس نے صاف انکار کر دیا کیونکہ وہ آپس کی شادیوں کو اچھا نہیں سمجھتی تھی۔ پھر کئی رشتے آئے لیکن کبھی اس کے ابّی کو رشتہ پسند نہیں آیا اور کبھی امّی کو۔ کسی کی ذات صحیح نہیں تھی تو کسی کی عمر زیادہ تھی اور کسی کی شکل وصورت اچھی نہ تھی۔ اسی چھان بین میں کئی سال گزر گئے، یہاں تک کہ اس کی چھوٹی بہن بھی شادی کے لائق ہوگئی۔ انہی دنوں ایک بڑے گھر سے رشتہ آیا۔ خاندانی لوگ تھے اور بڑی شان وشوکت والے تھے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ اور دونوں کی شادی ایک ہی گھر میں طے پا گئی۔ اسے یہ رشتہ بالکل پسند نہیں آیا کیونکہ ایک ہی گھر میں دو بہنوں کا بیاہا جانا اسے سخت ناپسند تھا۔ مگر اب وہ احتجاج کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ آخر کب تک وہ اپنے والدین کے سینے پر بوجھ بن کر پڑی رہتی۔ اس نے چپ چاپ اپنی قسمت کے فیصلے کو قبول کرلیا۔

بارات آ گئی تھی۔ سارے رسم و رواج چل رہے تھے۔ سبھی لوگ خوش تھے۔ دو دولہے، دو دلہنیں لیکن بارات ایک۔ لوگوں کے لیے یہ ایک انوکھی شادی تھی۔ سبھی لوگ خوش تھے لیکن اس کے اندر غصے کا لاوا پھوٹ رہا تھا۔ وہ آگ بگولہ ہو رہی تھی۔ اس کے لاکھ چاہنے کے باوجود اس کے ساتھ وہی کچھ ہو رہا تھا جو اسے پسند نہیں تھا۔ لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔

شادی ہوگئی اور دونوں بہنیں ایک ساتھ ایک ہی گھر میں پہنچیں۔ ان دونوں کا وہاں پُر جوش استقبال ہوا۔ ساس اماں دونوں کی بلائیں لے رہی تھیں، لاڈ دکھا رہی تھیں۔ کہتے ہیں کہ جسے اپنے بیٹے سے پیار ہوتا ہے وہ اپنی بہو کو بھی پیار کرتے ہیں۔

سسرال میں یہ اس کا پہلا دن تھا۔ پورے گھر میں میلہ لگا ہوا تھا۔ دائیوں اور نوکروں کی بھیڑ تھی۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ پھر کھانے کا گانگ بجا اور معلوم ہوا کہ ہر کام ایک بنے بنائے قانون کے تحت ہوتا ہے۔ ناشتے اور کھانے کا وقت مقرر ہے۔ سبھی لوگ ایک ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ کہاں جانا ہے کہاں نہیں جانا ہے؟ یہ اور اس طرح کے سارے فیصلے گھر کے سربراہ کرتے ہیں اور ان کا کہا حرف آخر ہوتا ہے۔ کسی کو کچھ بولنے کی مجال نہیں ہے۔ لیکن یہ سب اس کے لیے بہت زیادہ فکر کی بات نہیں تھی کیونکہ وہ خود بھی بہت قاعدے قانون والی لڑکی تھی۔ لیکن اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔ اس کی چھٹی حس اسے بار بار خبردار کر رہی تھی۔ لیکن اس گھر میں چند روز گزارنے کے بعد ہی اس کے سارے اندیشے صحیح ثابت ہوتے گئے۔ اسے معلوم ہوگیا کہ اس کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔ یہ گھر نہیں بلکہ چھوٹا موٹا ہسپتال تھا۔ یہاں ہر شخص بیمار تھا۔ کوئی ذہنی طور پر اور کوئی جسمانی طور پر۔ یہاں ہمیشہ ڈاکٹروں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ دونوں بیٹے بھی ذہنی اور جسمانی طور پر بیمار تھے۔ ایک ماں کے کہنے پر چلتا تھا اور دوسرا باپ کے اشارے پر ناچتا تھا۔ اس کا شوہر ماں کے اشارے پر چلتا تھا۔ ماں کہتی بیٹا منہ دھولو تو وہ منہ دھوتا۔ ماں کہتی بیٹا کپڑے بدل لو تو وہ کپڑے بدلتا۔ ماں کہتی بیٹا کھانا کھالو تو وہ کھانا کھاتا۔ اور پھر چند روز بعد ہی اسے معلوم ہوگیا کہ اس کا شوہر تو شادی کے لائق ہی نہیں تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اسے اپنی ساری زندگی تاریک نظر آنے لگی۔ وہ کیا کرے، کہاں جائے، کس سے کہے؟ پہلے تو غصے سے اس کا سارا بدن تھرتھرا گیا

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اپنے شوہر سے کچھ کہتی تو وہ جواب دیتا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے تو شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن میرے والدین نے زبردستی میری شادی کروادی۔ کچھ کہنا ہے تو انہی سے جا کر کہو۔

وہ اپنا سر پیٹ کر رہ گئی۔ پتا نہیں زندگی اس کا کیسا امتحان لے رہی ہے۔ لیکن امتحانات کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ جلد ہی اس کی چھوٹی بہن حاملہ ہوگئی۔ اب تو اس کے گھر والے اس سے طرح طرح کے سوال کرنے لگے۔ اسے یہ سب کچھ بتاتے ہوئے بڑی شرم آتی۔ اس نے اپنے منہ پر چپ کا تالا لگا لیا لیکن بولنے والوں کی زبان کب رکتی ہے۔ آخر کار اس نے اپنی والدہ کو صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ والدہ نے والد کو بتایا اور پھر دھیرے دھیرے یہ بات پورے خاندان میں پھیل گئی۔ اور پھر سبھوں نے مل کر ایک فیصلہ کیا۔ اور پھر پورے خاندان کی رائے ہوئی کہ اب راستہ بدل لینے میں ہی بھلائی ہے۔ سو راستے بدل گئے۔ زندگی کے معمول بدل گئے۔

اس کی زندگی پھر وہیں آ پہنچی جہاں سے چلی تھی وہ اس بات سے پریشان تھی کہ اس کی زندگی اب کس راہ پر جائے گی، آگے کیا ہوگا؟ وہ ایک دوراہے پر کھڑی تھی۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟؟

◀◀ ● ▶▶

ہم سفر

بارات آ گئی تھی۔

شادی ہال میں ہر طرف چہل پہل تھی۔ قہقہوں اور چہلوں کی آوازوں سے فضا گونج رہی تھی۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں تو ایک طرف، بزرگ مرد و زن بھی خوبصورت چمچماتی پوشاک میں ملبوس کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ثانیہ کی سہیلیاں اس کے کمرے میں آ آ کر اسے پل پل کی خبریں دے رہی تھیں اور وہ مسرت آمیز لہجے میں کرید کرید کر ان سے سارا حال معلوم کر رہی تھی۔ دولہا دیکھنے میں کیسا لگ رہا ہے، باراتی کتنے آئے ہیں، کیا بارات کے ساتھ عورتیں بھی آئی ہیں؟ وغیرہ وغیرہ اور سہیلیاں جان بوجھ کر اسے چھیڑ چھیڑ کر لطف اندوز ہو رہی ہیں۔ ایک کہنے لگی۔

''ہائے ثانیہ! دلہن بن کے تو کتنی اچھی لگ رہی ہے۔ کیا روپ نکھرا ہے تیرا؟'' ثانیہ اس کی بات سن کر شرما گئی اور بناوٹی غصے سے کہنے لگی۔

''چل ہٹ۔ مجھے معلوم ہے میں کیسی لگتی ہوں۔'' اور اتنا کہہ کر اس نے گھونگھٹ میں اپنا منہ چھپا لیا۔

آج کا دن اس کی زندگی کا سب سے بڑا دن تھا۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ واقعی اس کی شادی ہو رہی ہے۔ یوں تو وہ ایک اچھے خاندان کی پڑھی لکھی سلیقہ شعار لڑکی تھی لیکن دنیا والے سیرت سے زیادہ صورت دیکھتے ہیں۔ ایک تو اس کا رنگ کافی کم تھا اس کے چہرے پر کیل اور مہاسوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ اس نے لاکھ جتن کیے۔ طرح طرح کے ابٹن اور فیس ماسک استعمال کیے، جڑی بوٹیوں کا بھی سہارا لیا۔ کبھی نارنگی کے

چھلکوں کا استعمال کیا تو کبھی نیم کی پتیوں کا مگر اس کے چہرے پر وہ رعنائی اور خوبصورتی نہ آسکی جو رشتہ لے کر آنے والی عورتوں کو مطلوب تھی۔ اس کی عمر جیسے بڑھ رہی تھی، اس کے گھر والوں کی پریشانیاں بھی اسی طرح بڑھ رہی تھیں۔ اور خود وہ ہر طرف سے مایوس ہو چکی تھی۔ اسے اب یہ یقین ہو چلا تھا کہ اس کی قسمت میں شادی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ شاید اوپر والے نے اس کا جوڑا بنایا ہی نہیں ہے۔ وہ بہت ساری ایسی لڑکیوں کو جانتی تھی جن کی کبھی شادی نہ ہو سکی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ہر چیز اپنے وقت پر اچھی لگتی ہے۔ وقت پر اگر کھانا نہ ملے تو بھوک مر جاتی ہے پھر چاہے جیسے بھی عمدہ کھانے ملیں ان میں وہ ذائقہ نہیں ملتا جو بھوک کی حالت میں ملتا ہے۔ اب اس نے اپنی تمام تر توجہ اپنی تعلیم کی طرف مرکوز کر دی تھی۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی پر بوجھ بن کر رہے مگر قسمت کے کھیل بھی نرالے ہیں۔ اس کے گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ جس لوکل ٹرین میں بیٹھ کر وہ روز کالج جاتی ہے اسی میں اس کے خوابوں کا شہزادہ مل جائے گا۔

زیوروں سے لدی ثانیہ سر جھکائے انہی خیالوں میں گم تھی۔ اسے وہ دن یاد آیا جب اس نے ٹرین میں پہلی بار عارف کو دیکھا تھا۔ اونچا قد، کسرتی جسم، چہرے پر خاندانی شرافت کے نقوش اور ہونٹوں پر ایک دلنواز تبسم۔ ثانیہ نے اسے دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ اُف! کتنا خوبصورت نوجوان ہے۔ کاش اس کی زندگی میں بھی کوئی ایسا خوب رو، خوبصورت اور خوش جمال نوجوان آتا۔ لیکن نہیں، جب وہ خود اتنا خوبصورت ہے تو اس کے گھر والے تو اس سے زیادہ حسین لڑکی کی تلاش میں ہوں گے۔ پھر اس نے اپنے ذہن میں آرہے آوارہ خیالوں کو جھٹک دیا۔ پتہ نہیں کون ہے، کیا کرتا ہے، کنوارہ ہے یا شادی شدہ؟ مجھے کسی اجنبی مرد سے کیا لینا دینا۔ اور پھر میرے تو نصیب ہی کھوٹے ہیں۔ اگر اوپر والا ذرا اچھی شکل وصورت دے دیتا تو اس کے خزانے میں کیا کمی آجاتی؟

ایک روز حسب معمول وہ ٹرین میں سوار ہوئی تو اس نے اسی نوجوان کو سامنے والی سیٹ پر بیٹھا پایا۔ اسے دیکھ کر نوجوان کی آنکھوں میں شناسائی کی ایک ہلکی سی چمک لہرائی۔ اس نے نظریں جھکا لیں اور اپنے بیگ سے ایک کتاب نکال کر پڑھنے لگی۔ لیکن پڑھنے میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار اس کی بھٹکتی نگاہیں اس نوجوان کی جانب اُٹھ جاتیں۔ وہ بھی چوری چوری اسے دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں اسے اس کے بدصورت چہرے میں کیا نظر آرہا تھا کہ وہ اسے دیکھے ہی جا رہا تھا۔ اچانک اس کے کانوں میں ایک میٹھی آواز گونجی۔

''کیا آپ اسٹوڈنٹ ہیں؟'' اس نے نظریں اُٹھائیں۔ نوجوان اسی سے مخاطب تھا۔ اس کا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھا۔ کہاں پڑھتی ہیں؟ کیا کیا مضامین ہیں؟ اور کیا مشغلے ہیں؟ اور اس نے اٹک اٹک کر دھیرے دھیرے اس کے سوالوں کے جواب دیے۔ اور جب اس کی منزل آگئی تو اس نے الوداعی نظروں سے اسے دیکھا اور ٹرین سے اُتر گئی۔

وہ دن اس کی زندگی کا سب سے انوکھا دن تھا۔ وہ سارا دن اسی خیال میں کھوئی رہی کہ آخر اس میں کون سی ایسی بات ہے جو اس نوجوان کو پسند آگئی۔ شام کو جب وہ گھر واپس آئی تو اس نے ڈریسنگ ٹیبل میں اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔ آج پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ بہت خوش بدن ہے۔ صراحی دار گردن، متناسب بدن، اور لمبے، سیاہ اور گھنے بال۔ کاش! اس کی شکل بھی اچھی ہوتی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اس کے ساتھ ہی نوجوان کی یاد کسی دلفریب خوشبو کی طرح اس کی سانسوں میں گھل گئی۔

اس دن کے بعد سے اس نے اپنے لباس اور بالوں پر خاص دھیان دینا شروع کیا۔ لیکن فطری جھجھک اور احساس کمتری سے نجات نہ پا سکی۔ ٹرین میں اس کی ملاقات روز اس نوجوان سے ہو جاتی جس نے اپنا نام عارف بتایا تھا۔ عارف نے اسے بتایا کہ وہ ایک چھوٹی

سی فیکٹری کا مالک ہے جس میں مختلف قسم کی مصنوعات بنائی جاتی ہیں۔اس کی فیکٹری اس کے کالج کے قریب ہی ہے۔ پھر دھیرے دھیرے یہ ملاقات ٹرین کے علاوہ دوسری جگہوں پر بھی ہونے لگی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے فون نمبر اور وھاٹس ایپ نمبر کا بھی تبادلہ کیا۔ دونوں کے درمیان دوریاں کم ہونے لگی تھیں لیکن ثانیہ کے ذہن میں کبھی بھی یہ بات نہیں آئی کہ وہ اس سے شادی کرلے گا۔ وہ اسے صرف ایک اچھا دوست سمجھتی تھی جس سے اپنے دل کی باتیں کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیا کرتی تھی۔ایک روز عارف اس سے پوچھ ہی بیٹھا۔

''آپ اتنی اُداس، اتنی چپ چپ کیوں رہتی ہیں؟ عارف کا سوال سن کر وہ چونک پڑی۔کیا کہے کیا بتائے؟

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے اپنی پڑھائی کی فکر ہے۔تعلیم مکمل ہو جائے تو کوئی نوکری تلاش کروں گی۔زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا نا!''

''اور آپ کے والدین، گھر والے، بھائی بہن؟''

''سب ہیں لیکن میں زندگی بھر کسی پر بوجھ بن کر رہنا نہیں چاہتی۔''

''کیوں۔شادی نہیں کرنی ہے آپ کو؟'' وہ بڑی بے باکی سے پوچھ بیٹھا۔ پھر خود ہی سٹپٹا گیا۔ایک لڑکی سے اسے ایسا پرسنل سوال نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔اسے لگا شاید ثانیہ کو اس کی بات بُری لگی ہو۔مگر ثانیہ نے اس کی بات کا بُرا نہیں مانا۔بس اپنی بڑی بڑی حیران سی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''کون کرے گا مجھ جیسی کالی اور بدصورت لڑکی سے شادی؟''

عارف چند لمحوں تک اسے غور سے دیکھتا رہا، پھر بولا۔

''میں کروں گا تم سے شادی۔اگر تم راضی ہو تو۔''

ثانیہ نے بے یقینی سے اس کی جانب دیکھا۔کافی دیر تک تو وہ کچھ بول ہی نہ پائی۔ پھر بڑی مشکل سے بولی۔

''آخر مجھ میں ایسی کون سی خوبی ہے کہ آپ مجھ سے شادی کرنے کا خیال کر بیٹھے۔''

''دیکھو ثانیہ! یہ حسن کے جلوے تو چار دن کی چاندنی ہیں۔اصل چیز انسان کی سیرت اور اور اس کا مزاج ہے۔ میں اتنے دنوں سے تمہارا نفسیاتی مطالعہ کر رہا تھا اور مجھے پورا یقین ہے کہ تم سے شادی کر کے میں ایک خوشگوار زندگی گزاروں گا۔'' وہ اپنی بات کہہ کر چند لمحوں تک اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر ثانیہ نے پوچھا۔

''اور آپ کے گھر والے؟''

''جو میری پسند وہ میرے گھر والوں کی پسند۔'' عارف نے مسکرا کر کہا۔

قاضی صاحب جب اس کی اجازت لینے پہنچے تو دلہن بنی ثانیہ اپنے خیالوں سے باہر آئی۔اور سوچنے لگی کہ یہ کیسا سفر تھا جس نے اسے اتنا اچھا ہم سفر دے دیا۔

◀◀ ● ▶▶

شور

''اف خدا! یہ شور شرابا۔''

ابھی تو فجر کی نماز پڑھ کر سوئی ہوں۔ نیند بھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ نماز پڑھ کر جو سوتی ہوں تو پھر سات بجے سے پہلے اٹھتی نہیں ہوں لیکن نیند کیا خاک آئے گی۔ صبح سے ہی شور شرابا شروع ہو جاتا ہے۔ کالونی میں جتنے بھی گھر ہیں سب آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ کسی گھر میں کوکر کی سیٹی بج رہی ہے تو کوئی ٹیمپو والا ہارن دیتا ہے۔ کوئی رکشے والا کسی بچے کا نام لے کر پکار رہا ہے..... جلدی کرو دیر ہو جائے گی۔ ہر طرف گہما گہمی رہتی ہے۔ میرے گھر کے نچلے حصے میں کرائے دار رہتے ہیں۔ ان کے بھی دو چھوٹے بچے ہیں۔ وہ لوگ بھی سویرے ہی اُٹھ جاتے ہیں۔ ٹفن پیک کرنا، ڈریس پہنانا..... یہ سب کام خاموشی سے بھی ہو سکتے تھے..... لیکن نہیں جو کام بھی ہوگا شور شرابہ کے ساتھ ہی ہوگا۔ سبھی آوازیں کان میں چھید کرتی ہوئی نکلتی ہیں۔ جب سارے بچے اسکول چلے جاتے ہیں تو بالکل سناٹا چھا جاتا ہے۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں آتی۔ سارا ماحول پُرسکون ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے سبھی لوگ اپنے بچوں کو اسکول بھیج کر پھر سے گہری نیند کی آغوش میں کھو گئے ہوں۔ لیکن اب میرے اُٹھنے کا وقت ہو جاتا ہے۔ میں اپنی نیند کو خیر باد کہہ کر تیار ہو جاتی ہوں۔ پھر تو مجھے بہت سارے کام کرنے ہوتے ہیں۔ میرے شوہر کو بھی آفس جانا ہے۔ لیکن پہلے انہیں بیڈ ٹی بنا کر دینا ہے، ہلکے ناشتہ کے ساتھ۔ ہر بات کا خیال رکھنا ہے۔ پھر سوچنا کہ ناشتے میں کیا بنانا ہے، لنچ میں کیا لے جانا ہے؟ ان سے مشورہ کر کے میں اپنے کاموں میں لگ جاتی ہوں۔ وقت پر سب کام کر دینا ہے۔

ان کے جانے کے بعد گھر کے بچے ہوئے کاموں کو نپٹانا۔ یہ سب روز کا معمول ہے۔ دن کے وقت میں اپنی نیند پوری کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن جیسے ہی نیند آئے گی، کوئی نہ کوئی آ جائے گا..... کسی نہ کسی کام سے۔ لگتا ہے جیسے سب کو پتہ ہے کہ میں سوئی ہوئی ہوں۔ گھر میں اکیلی ہوں۔ اس لیے ہر وقت الرٹ رہنا پڑتا ہے۔ کون کب آ جائے۔ اس لیے اب تو دن میں سونا بھی حرام ہو گیا ہے۔ آنکھ بند بھی کرتی ہوں تو نیند نہیں آتی۔ دیر رات گئے تک جاگنے کا اب تو فیشن بن گیا ہے۔ دیر رات تک جاگنا..... صبح لیٹ سے اُٹھنا۔ کبھی کبھی رات میں نیند بھی اُچٹ جاتی ہے اور پھر کب آتی ہے پتہ بھی نہیں۔ چلتا دماغ میں الارم فٹ ہے۔ جیسے ہی کانوں میں اذان کی آواز آئے گی، نیند کھل جائے گی۔ اذان سن کر میں اُٹھ جاتی ہوں۔ نماز پڑھتی ہوں، پھر سو جاتی ہوں۔ ابھی نیند بھی نہیں آتی ہے کہ کالونی میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ ورکنگ ڈے ہے۔ سب کے پاس الگ الگ طریقے کے کام ہیں۔ آلو پیاز والا، سبزی والا، دودھ والا، مچھلی والا..... ساری آوازیں گونجنے لگتی ہیں۔ سب کو صبح صبح ہی آنا ہوتا ہے۔ ساری آوازیں کانوں سے ٹکراتی ہوئی..... میری پیاری سی نیند کو بھگاتی ہوئی..... مجھے اپنے بیڈ کو خیر باد کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

لیکن آج میرے کان سے ایک الگ آواز ٹکرائی۔ آپ ابھی تک سوئی ہیں..... نیند پوری نہیں ہوئی ہے؟ سات کب کے بج چکے ہیں۔

میں آنکھ ملتی ہوئی اُٹھی۔ بالکنی سے جھانک کر باہر دیکھا تو ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کہیں کوئی ہلچل نہیں تھی۔ سب اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔ کیونکہ پورے ملک میں لاک ڈاؤن نافذ کر دیا گیا تھا۔ نہ کسی کو کہیں جانا ہے نہ کسی کو آنا ہے۔ اسکول، کالج، آفس سب بند پڑے تھے۔ کسی کو کوئی جلدی نہیں تھی۔ میری رگ و پے میں عجب طرح کا سکون اُترتا

چلا گیا۔ کیا میں کوئی خواب دیکھ رہی تھی؟ میں نے اپنے بازو میں ہلکی سی چٹکی لی۔ نہیں یہ حقیقت تھی۔ آج بچوں کو اسکول نہیں جانا تھا۔ بڑوں کو آفس نہیں جانا تھا۔ سبزی والے، ٹھیلے والے سب غائب تھے۔ میں نے ایک زور کی سانس لی اور اس پُرسکون فضا کو اپنے اندر اُتار لیا۔

پھر چند روز ایسے ہی پُرسکون گزرے لیکن دھیرے دھیرے یہ خاموشی مجھے اندر ہی اندر کاٹ کھانے لگی۔ کہیں کوئی آواز، کوئی شور نہیں۔ صرف پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آتیں۔ سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند تھے۔ بازار بند تھے۔ لوگ بے روزگار ہو رہے تھے۔ آخر بھوک نے لوگوں کو گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ مدد مانگنے والوں کی قطاریں لگنے لگیں۔ کئی مددگار ہاتھ آگے آنے لگے۔ گلی میں آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لیکن اسکول کالج ابھی تک بند تھے۔ انہیں آفس بھی جانا نہیں تھا۔ صبح کورکشے والے اور ٹیمپو والے کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ میں آرام سے دیر تک سوئی پڑی رہتی۔

ایک روز میری کالونی میں ایک دل دہلا دینے والا حادثہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ ہمارے پڑوسی جو دہلی کے کسی ہسپتال میں زیر علاج تھے، وہ انتقال کر گئے۔ یہاں ان کا گھر تھا۔ سارے رشتہ دار یہاں تھے۔ اس لیے ان کے گھر والے انہیں ایمبولنس سے لے کر یہاں آ گئے۔ اب کیا تھا، کالونی والوں کو خبر لگ گئی۔ کسی نے افواہ اڑا دی کہ انہیں تو کرونا ہو گیا تھا۔ اس وقت دلی میں یہ مرض بہت زیادہ پھیلا ہوا تھا۔ پوری کالونی میں ہلچل مچ گئی۔ لوگ ایمبولنس کو کالونی کے اندر داخل نہیں ہونے دے رہے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ لاک ڈاؤن کی وجہ سے پہلے ہی سے بہت ساری پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر کہیں خدانخواستہ پوری کالونی سیل کر دی گئی تو نہ جانے اور کیا ہوگا۔ لیکن پھر کچھ سنجیدہ لوگ سامنے آئے۔ انہوں نے سبھوں کو سمجھایا کہ اگر یہ کرونا کا کیس ہوتا تو ہسپتال والے لاش افراد خانہ کو سپرد ہی نہیں کرتے بلکہ اوپر ہی اوپر آخری رسومات

ادا کر دی جاتیں۔ خیر ایمبولنس کالونی کے اندر آئی اور میرے ہی گھر کے سامنے رکی۔ پوری کالونی میں سناٹا پسر گیا۔ بہت سارے لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو گئے۔ میں نے بھی اپنے گھر کی ساری کھڑکیوں اور دروازوں کو بند کر دیا۔ ڈر کے مارے میرا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ دہشت کے مارے میری روح کانپ رہی تھی۔ ہر شخص کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔

اب دھیرے حالات معمول پر آ رہے ہیں۔ بازار اور آفس کھلنے لگے ہیں۔ سڑکوں پر لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی ہے۔ لیکن وہ پہلے جیسی چہل پہل نہیں ہے۔ بچوں کے اسکول ابھی تک بند ہیں۔ صبح سات آٹھ بجے تک گلی میں سناٹا ہی چھایا رہتا ہے۔ کبھی کبھی یہ سناٹا بہت کھلنے لگتا ہے۔ میں سوچتی ہوں کہ میری نیند پوری ہو یا نہ ہو، بچوں کا شور پھر سے سنائی دے۔

◀◀ ● ▶▶

جھوٹا سچ

''مینا! دیکھو،تمہارے نئے ماسٹر صاحب آئے ہیں۔کتابیں لے جاؤ اور باہر کے کمرے میں جا کر پڑھو۔'' پانچ سال کی مینا سے اس کی ممی نے کہا۔

مینا اپنی، کاپی اور پنسل لے کر کمرے میں داخل ہوئی اور ماسٹر صاحب کو آداب بجا لائی۔ماسٹر صاحب کرسی پر بیٹھ گئے اور پوچھنے لگے۔

''تمہارا نام کیا ہے بیٹی!''

''سر! مجھے مینا رضوی کہتے ہیں۔''اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔دیکھو مینا بیٹی! تمہیں خوب دل لگا کر پڑھنا ہے اور آج پڑھائی کا پہلا دن ہے۔آج کا سبق صرف یہ ہے کہ ہمیشہ سچ بولو اور بڑی سے بڑی مصیبت اور پریشانی میں بھی کبھی جھوٹ مت بولو۔''

مینا نے کہا۔

''جی، بہت اچھا۔میں ایسا ہی کروں گی۔'' پھر کچھ ٹھہر کر اس نے پوچھا۔

''سر! کتاب نکالوں؟'' ماسٹر صاحب بولے۔

''نہیں۔آج کا سبق صرف اتنا ہے کہ ہمیشہ سچ بولو۔''

شام کو جب مینا کے پاپا آفس سے آئے تو انہوں نے پوچھا۔

''مینا! آج ماسٹر صاحب نے کیا پڑھایا؟''

''کچھ بھی نہیں۔صرف اتنا کہا کہ ہمیشہ سچ بولو۔پاپا! کیا ہمیشہ سچ ہی بولنا چاہیے؟''

''ہاں بیٹے۔''انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اسی دوران مینا کی ممی شکیلہ کمرے میں داخل ہوئیں اور انہوں نے پوچھا۔

''مینا! ماسٹر صاحب کا دیا ہوا ہوم ورک کر لیا۔''

''نہیں ممی! آج انہوں نے کوئی ہوم ورک دیا ہی نہیں۔''

''کیوں؟''شکیلہ نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ مینا کوئی جواب دیتی اس کی دادی اماں درمیان میں بول پڑیں۔

''ارے۔آج کل کے ماسٹر تو صرف پیسہ کمانے آتے ہیں۔میں تو شروع سے کہہ رہی ہوں کہ لڑکی کو پڑھانا بیکار ہے۔لیکن میری کوئی سنتا ہی نہیں خواہ مخواہ پیسے کی بربادی۔کل لڑکی بڑی ہوگی۔اس کی شادی میں کافی خرچ آئے گا۔ابھی سے پیسے بچا کر رکھنا چاہیے۔''

''ارے امّاں! اب زمانہ بدل گیا ہے۔لوگ چاند پر جا پہنچے ہیں۔لڑکیوں کو ہم کیوں جاہل رکھیں۔اگر ماں تعلیم یافتہ ہوگی تو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دے گی۔''عباس صاحب نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔بیٹے کی بات سن کر وہ ناراض ہوگئیں۔کہنے لگیں۔

''مجھے کیا کرنا ہے۔آج کل کوئی میری بات سنتا ہی نہیں۔جو تم لوگوں کے جی میں آئے، کرو۔''

مینا درمیان میں بول پڑی۔

''ماسٹر صاحب نے صرف سچ بولنے کے لیے کہا ہے۔''

''ہاں بیٹی! بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی کبھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔''شکیلہ نے کہا۔مینا کہنے لگی۔

''ممی! کیا تمہارے ماسٹر صاحب نے بھی یہی پڑھایا تھا کیا؟''

''ہاں بیٹی!''شکیلہ نے جواب دیا۔

اتنے میں کال بیل کی تیز آواز نے سب کو چونکا دیا۔شکیلہ نے بالکنی سے جھانک کر دیکھا۔ نیچے عباس صاحب کے دوست زیدی صاحب کھڑے تھے۔شکیلہ بالکنی سے ہٹ گئی اور کمرے میں آکر عباس صاحب سے کہا۔

''اجی سنتے ہیں،زیدی صاحب آئے ہیں ،کیا کہوں؟''عباس صاحب نے ناگواری کے ساتھ کہا۔

''ابھی مجھے کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔کہہ دو کہ نہیں ہیں۔''مینا نے حیرت سے پاپا کو دیکھا۔

شکیلہ نے نیچے جا کر دروازہ کھولا اور بتایا کہ عباس صاحب ابھی گھر پر نہیں ہیں۔زیدی صاحب اوران کی بیگم مایوس ہوکر لوٹنے لگے تو شکیلہ نے نہایت اخلاق سے کہا۔

''وہ نہیں ہیں تو کیا ہوا،میں ہوں نا! آیئے اندر آیئے۔وہ آتے ہی ہوں گے۔''

زیدی صاحب اپنی بیگم کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آکر صوفے پر بیٹھ گئے۔زیدی صاحب کہنے لگے۔

''عباس صاحب کہاں رہ گئے۔سات بجے تک تو وہ آفس سے واپس آجایا کرتے ہیں۔''

''ہاں وہ ابھی تک نہیں لوٹے ہیں۔شاید اُور ٹائم کر رہے ہوں۔

''حالت خراب ہوگئی بیگم! اتنی دور سے چل کر آئے اور معلوم ہوا کہ عباس صاحب گھر پر نہیں ہیں۔''

''اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔عباس بھائی نہ سہی شکیلہ بھابھی سے تو ملاقات ہوگئی۔ابھی بھابھی کے ہاتھوں کی بنی گرما گرم کافی آپ کی ساری تھکن دور کر دے گی۔کیوں بھابھی؟''تبسم نے مسکرا کر شکیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں ،ہاں کیوں نہیں۔ابھی بنا کر لاتی ہوں۔''شکیلہ نے بناوٹی مسکراہٹ کے

ساتھ جواب دیا۔

پھر جب تھوڑی دیر بعد شکیلہ کافی بنا کر لائی تو اس کے ساتھ ساتھ مینا بھی آ گئی۔زیدی صاحب نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''واہ بھابی واہ! کیا شاندار کافی بنائی ہے۔ایک ہی گھونٹ میں ساری تھکن دور ہوگئی۔''

''ارے بھائی صاحب ! یہ سب آپ لوگوں کے قدموں کی برکت ہے۔ورنہ میں کافی بنانا کہاں جانتی ہوں۔''

اسی درمیان اچانک مینا بول پڑی۔

''لیکن ممی! ابھی تو آپ کافی بناتے وقت کہہ رہی تھیں کہ نجانے کہاں کہاں سے چلے آتے ہیں۔اب تو بن بلائے مہمانوں سے بچنے کے لیے کسی دوسری جگہ گھر لینا ہوگا۔''زیدی صاحب اوران کی بیگم مینا کی بات سن کر چونک گئے اور دونوں نے اپنے اپنے کپ ٹیبل پر واپس رکھ دیے۔شکیلہ گھبرا گئی اور مینا کو ڈانٹتے ہوئی بولی۔

''مینا اوپر جا کر پڑھائی کرو۔''

''لیکن پاپا نے تو کہا کہ میرا پیچھا چھوڑ واور نیچے جاؤ۔''بات اب زیدی صاحب اور ان کی بیگم کی برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ وہ پوری صورت حال سے واقف ہو چکے تھے۔دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور تبسم نے زیدی صاحب کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''چلیے جی! بہت ہو چکی بے عزتی۔کیا ہم نے کبھی کافی نہیں پی ہے۔''دونوں جانے لگے تو شکیلہ نے کھسیاتے ہوئے کہا۔

''سنیے تو،رکیے ذرا۔''مگر وہ دونوں اتنی دیر میں باہر نکل چکے تھے۔

تھوڑی دیر بعد عباس صاحب اور شکیلہ دونوں مل کر مینا کو پیٹ رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔

''کم بخت ! کتنی بار کہا ہے کہ بڑوں کے بیچ میں نہیں بولا کرتے۔مگر یہ مانتی ہی نہیں۔ہم نے منع کیا تھا کہ یہ مت بتانا کہ پاپا گھر میں ہیں، پھر بھی بتا دیا۔''

اور مینا بھیگی آنکھیں لیے سسکتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ماسٹر صاحب، ممی پاپا، سب ہی یہی کہتے ہیں کہ کبھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے ، ہمیشہ سچ بولنا چاہیے لیکن خود جھوٹ بولتے ہیں۔بڑے ہمیں جو کچھ سکھاتے پڑھاتے ہیں اس پر خود عمل کیوں نہیں کرتے۔

◀◀ ● ▶▶

کوئلہ بھئی نہ راکھ

میں جس کالونی میں رہتی ہوں اس کے قریب ہی مزدور پیشہ افراد کی بستی ہے۔ان کے مرد یا تو رکشہ چلاتے ہیں یا مزدوری کیا کرتے ہیں۔عورتیں زیادہ تر گھروں میں کام کیا کرتی ہیں۔یہ لوگ آپس میں مل جل کر بھی رہا کرتے ہیں اور خوب خوب لڑائیاں بھی کیا کرتے ہیں۔اس بستی کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہاں کے لوگ ہر طرح سے آزاد ہیں۔ان کے ہاتھ پیر، زبان اور نظر سب آزاد ہیں۔یہاں عشق و عاشقی کا کھیل بھی خوب خوب ہوتا ہے۔اکثر سننے میں آتا ہے کہ فلاں کی لڑکی فلاں لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی یا پھر لڑکے نے اپنی بیوی کو چھوڑ کر کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لی۔ جب کبھی ایسے واقعات ہوتے ہیں تو دونوں طرف سے خوب لڑائیاں ہوتی ہیں، مار پیٹ ہوتی ہے، لوگ زخمی ہوتے ہیں لیکن کچھ دنوں بعد پھر سب کچھ پہلے کی طرح ہو جاتا ہے اور سبھی لوگ ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں برابر کے شریک ہو جاتے ہیں۔

کالونی کے ایک سرے پر یہ مزدور بستی ہے اور دوسرے سرے پر چہار دیواری سے گھِرا ہوا ایک بڑا قبرستان ہے۔جب کبھی کالونی میں یا مزدوروں کی بستی میں کسی کا انتقال ہوتا ہے تو جنازہ میرے گھر کے سامنے ہی سے گزرتا ہے۔اس قبرستان کے کئی دوسرے مصرف بھی ہیں مثلاً بستی کی عورتیں اس میں اپنی بکریاں چراتی ہیں، بہت سارے لوگ اس میں صبح سویرے فراغت حاصل کرتے ہیں اور لڑکے جوا کھیلتے ہیں۔

چند سال قبل تک اس بستی کے لوگوں کی حالت بہت خراب تھی۔زیادہ تر مٹّی کے بنے

کچے گھر تھے۔کسی کے یہاں بجلی نہیں تھی۔یہاں کی عورتیں لکڑی اور گوٹھے پر کھانا پکاتی تھیں۔لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ان کے حالات بدلنے لگے۔جو بچے دن بھر کالونی کی گلیوں میں آوارہ گردی کیا کرتے تھے وہ بڑے ہوتے ہی دلی،کلکتہ، جے پور یا پنجاب کے کسی شہر میں نکلنے لگے اور وہاں سے روپئے کما کر گھر بھیجنے لگے۔کچھ سرکاری یوجناؤں نے بھی ان کی مدد کی اور ان کے حالات بہتر سے بہتر ہوتے چلے گئے۔اب کئی مکانات نہ صرف پختہ ہو چکے ہیں بلکہ دو منزلہ بھی بن چکے ہیں۔ بچے اور بچیاں اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے لگے ہیں۔زیادہ تر گھروں میں کلر ٹی وی اور گیس کے چولہے آ گئے ہیں۔بستی کے نوخیز لڑکے ہاتھوں میں قیمتی موبائل لیے گھومتے رہتے ہیں۔رات کے وقت کئی لڑکے کسی ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور موبائل پر پتہ نہیں کیا کیا دیکھتے رہتے ہیں۔ان سب باتوں کے باوجود ابھی بھی کچھ گھروں کی صورت پہلے ہی جیسی ہے۔یہاں کے مکین یہیں رہ کر اپنی روزی روٹی کما رہے ہیں۔کچھ لوگ رکشہ چلاتے ہیں، کچھ مزدوری کرتے ہیں اور اب تو ای رکشہ کا بھی رواج شروع ہو گیا ہے۔ انہی میں سے ایک گھر سکینہ کا بھی ہے جسے لوگ عام طور پر سا کو کہہ کر پکارا کرتے ہیں۔اس کا مائیکہ کسی دردراز کے گاؤں میں تھا۔والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔رشتہ داروں نے ازراہ ہمدردی اس کی شادی کرا دی۔اس کے شوہر کا نام رفیق تھا۔اس کے والدین بھی اس دنیا سے گزر چکے تھے۔رفیق راج مستری کا کام کرتا تھا۔محنتی تھا لہذا اس کے پاس کام کی کمی نہیں تھی۔ مہینے بھر میں اچھے خاصے پیسے کما لیتا۔شادی کے چھ برس کے اندر اندر سکینہ چار بچوں کی ماں بن چکی تھی اور پانچواں اس کے پیٹ میں تھا۔

اچھا! ذرا ٹھہرئے۔ایک بات تو میں بتانا ہی بھول گئی۔ یہ جو عورت تھی نا سکینہ، میں تو اسے جانتی بھی نہ تھی۔اسے کبھی دیکھا تک نہ تھا۔اس کے نام سے بھی واقف نہیں تھی۔ پھر آپ

پوچھیں گے کہ میں اس کے بارے میں اتنی تفصیل سے کیسے جانتی ہوں۔بات دراصل یہ ہے کہ کل اچانک مزدوروں کی بستی سے رونے دھونے کی آوازیں آنے لگیں۔آوازیں اتنی بلند تھیں کہ کالونی کے سبھی لوگ اپنے گھروں سے نکل پڑے۔عورتیں بالکونی سے جھانکنے لگیں۔ میری پڑوسن بڑی تیز اور پھرتیلی ہے۔ وہ آس پاس کی تمام خبریں رکھتی ہے۔ مجھے زیادہ تر معلومات اسی سے حاصل ہوتی ہیں۔وہ اپنے گھر سے تیزی کے ساتھ نکلی اور مزدوروں کی بستی کی جانب دوڑ پڑی۔اور میں بے صبری کے ساتھ اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔صبح کا وقت تھا اور گھر کے سارے کام بکھرے پڑے تھے۔ میں نے جلدی کام سمیٹنے شروع کیے لیکن دل اور دماغ تو کہیں اور تھا۔خیر! خدا خدا کر کے کوئی آدھے گھنٹے کے بعد وہ لوٹی اور پھر اس نے جو روداد سنائی اسے سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

سکینہ کھانا بنانے کے دوران بری طرح جل گئی تھی۔

جل گئی یا جلا دی گئی؟ ایک سوال میرے ذہن میں کوند سا گیا۔لیکن اسے کون جلائے گا؟ ساس، سسر، نند، دیور.....کوئی بھی تو نہیں ہے۔تو کیا اس کے شوہر نے اسے جلا دیا؟ لیکن کیوں؟؟

میں دن بھر اسی اڈھیڑ بُن میں رہی۔کسی بھی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ میری پڑوسن ہر تھوڑی دیر بعد تازہ خبر لے کر آتی۔اسی سے معلوم ہوا کہ یہاں کے ڈاکٹروں نے اسے پٹنہ ریفر کر دیا ہے۔ پھر خبر آئی کہ وہ پٹنہ پہنچ گئی ہے اور اس کا علاج چل رہا ہے۔سارا دن صرف اسی کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر رات آئی۔میرے شوہر کو اس قسم کی باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔وہ اپنے آس پاس ہونے والے واقعات سے عموماً بے خبر رہتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ اپنی مشغولیت کی وجہ سے انجان رہتے ہیں یا جان بوجھ کر انجان بنتے ہیں۔لیکن جب کوئی نئی

بات ہوتی ہے تو میرے دل میں کھد بدسی ہونے لگتی ہے اور جب تک میں انہیں پوری بات بتا نہیں دیتی میرا دل ہلکا نہیں ہوتا ہے۔ میری بات سن کر وہ یا تو خاموش رہتے ہیں یا پھر ایک چھوٹا سا جملہ بول کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں نے جب انہیں آج کے واقعے سے آگاہ کیا تو انہوں نے فوراً جواب دیا۔

''کسی نے جلا کر مارنے کی کوشش کی ہوگی۔ جو عورت برسوں سے کھانا پکاتی آ رہی ہے وہ یوں نہیں جل جاتی۔'' ان کی بات سن کر تو میں جل ہی گئی لیکن کوئی جواب نہ دیا۔

رات گزری۔ صبح آئی۔ ابھی میں منھ ہاتھ دھو کر بیٹھی ہی تھی کہ پڑوسن نے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ آتے ہی کہنے لگی کہ سکینہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی لاش لائی جا رہی ہے۔ اتنا کہہ کر تو وہ چلی گئی لیکن میرا دل اندر سے بیٹھ گیا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ ایک انجان عورت کے لیے میرے دل میں اتنا درد کہاں سے پیدا ہو گیا۔ شاید یہ ایک عورت کا دوسری عورت سے فطری لگاؤ ہے۔ میرا دل اندر سے اچاٹ ہو گیا۔ میں نے بے دلی کے ساتھ گھر کے کاموں کو انجام دیا اور جب میرے شوہر ناشتہ کر کے آفس کے لیے نکل گئے تو میں خود گھر کو تالا لگا کر پڑوسن کے یہاں جا پہنچی۔ وہ بھی شاید کسی کے انتظار ہی میں تھی جس سے وہ سارا ماجرا بیان کرتی۔ پھر وہ کہتی گئی اور میں سنتی گئی۔

سکینہ کے شوہر رفیق کا پڑوس کی ایک جوان اور کنواری لڑکی سے عشق ہو گیا تھا اور یہ عشق کوئی ڈھکا چھپا نہیں تھا بلکہ مزدوروں کی پوری بستی اس سے واقف تھی۔ بات صرف عشق و عاشقی کی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔ بات تو یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ رفیق اپنی ساری کمائی اپنی معشوقہ پر خرچ کرنے لگا تھا۔ اس کے خوب اچھے اچھے کپڑے خرید کر لاتا۔ میک اپ کے سامان دیتا۔ کھانے پینے کی چیزیں دیتا جبکہ اس کے اپنے بچے کھانے دانے کو محتاج ہو رہے

تھے۔ اس بات کو لے کر اکثر دونوں میں لڑائی ہونے لگتی۔ رفیق غصے میں اسے دھُن کر رکھ دیتا۔ وہ روتی بلکتی رہتی۔ اب تک اس نے کسی دوسرے کے گھر میں کام نہیں کیا تھا لیکن اب وہ سوچ رہی تھی کہ وہ بھی کہیں کوئی کام پکڑ لے۔ آخر ایسا کب تک چلے گا؟ لیکن رفیق اسے کہیں کام بھی کرنے نہیں دیتا تھا۔ ایک روز گلی میں اس کا سامنا رفیق کی معشوقہ سے ہو گیا۔ اس کے دل میں تو گرمی بھری ہوئی تھی۔ اسے سامنے پا کر اس نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنی شروع کی۔ دونوں میں تو تو میں میں شروع ہوئی تو کافی لوگ جمع ہو گئے اور پھر بیچ بچاؤ کر کے دونوں کو الگ کروایا گیا۔ اس وقت اس لڑکی کا باپ کام پر گیا ہوا تھا۔ جب وہ واپس لوٹا اور اسے ساری بات معلوم ہوئی تو وہ سکینہ کے گھر پر جا پہنچا اور اسے یہ کہہ کر خوب کھری کھوٹی سنائی کہ وہ اس کی معصوم بیٹی کو بدنام کر رہی ہے۔ تب اسے احساس ہوا کہ اس لڑکی کے گھر والے بھی اسی کا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ چپ چاپ روتی رہی۔ اور جب شوہر آیا تو اس نے اسے نہ صرف خوب مارا بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ جلد ہی اس سے شادی کرنے والا ہے اور دنیا کوئی بھی طاقت اسے ایسا کرنے سے نہیں روک سکتی۔

گھر کے آگے والی سڑک پر کچھ لوگوں کے بولنے کی آوازیں آئیں تو میں نے بالکونی سے جھانک کر دیکھا۔ جنازہ جا رہا تھا۔ میں ایک کنارے کھڑی ہو کر دیکھنے لگی اور ان میں سے سکینہ کے شوہر کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگی لیکن میں اتنے لوگوں کے بیچ اسے پہچان ہی نہیں پائی۔ کیسے پہچانتی؟ میں نے اسے پہلے کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ جنازہ آگے بڑھ کر قبرستان میں داخل ہو گیا اور میں بالکونی سے ہٹ کر کمرے میں آ گئی۔ گھر میں کرنے کو بہت کام تھے لیکن ذہن سکینہ ہی میں الجھا ہوا تھا۔ شوہر سے جھگڑا ہونے کے دوسرے ہی روز وہ جل گئی۔ لیکن جب پولس ہسپتال میں اس سے بیان لینے پہنچی تو اس نے بتایا کہ.....کھانے بنانے کے دوران

گیس رسنے کی وجہ سے آگ لگ گئی تھی۔

لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ گیس سلنڈر سے آگ کیا صرف سکینہ کو جلانے کے لیے نکلی تھی؟ آگ پورے گھر میں پھیلی کیوں نہیں؟

◂◂ ● ▸▸

یقین

''سارا تم کب تک یونہی بیٹھی رہو گی؟''

نسرین نے گم صُم بیٹھی اپنی سہیلی سے بیچارگی کے عالم میں پوچھا لیکن سارا کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی جو کافی دیر سے آسمان میں اڑتے ہوئے بادلوں کے ٹکڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ برسات کا موسم آ کر جا چکا تھا مگر اب پہلے جیسی برسات کہاں؟ برسات کے جھولے کہاں؟؟ رم جھم بارش کی پھوار کہاں؟؟؟ پچھلے کئی برسوں سے ساون پیاسا ساون بن کر رہ گیا تھا۔ بس ہلکے ہلکے بادل آتے اور بغیر برسے گزر جاتے۔

اس کی زندگی بھی تو پیاسا ساون بن کر رہ گئی تھی۔ عورت تو دھرتی کی طرح ہوتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ کوئی مرد اس پر بادل بن کر برس جائے۔ اسے سیراب کر دے۔ اس کے جنم جنم کی پیاس بجھا دے۔ اس کی زندگی میں بادل آیا بھی لیکن بغیر برسے گزر گیا۔ بالکل ان بادلوں کی طرح جو آسمان میں ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے مگر برسنے کا نام تک نہیں لیتے تھے۔

اب وہ بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ دل شکستہ اور دل گرفتہ۔ اب اسے زندگی کی راہیں مسدود نظر آ رہی تھیں۔ حال مایوس کن تھا اور مستقبل غیر یقینی۔ وہ مایوسی اور خوف کی ملی جلی کیفیت کا شکار تھی۔ نسرین کی لاکھ کوششوں کے بعد بھی اس کی حالت جوں کی توں تھی لیکن نسرین نے بھی شائد یہ طے کر لیا تھا کہ وہ اپنی عزیز سہیلی کو یاس و ناامیدی کی اس کیفیت سے باہر نکال کر ہی دم لے گی۔

آسمان میں اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے بادل کسی اور جانب نکل گئے تھے اور اب آسمان کسی سونی مانگ کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

''وہ دیکھو! کتنا خوبصورت منظر ہے۔'' نسرین نے مغرب کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا جہاں دور اُفق پر سورج غروب ہو رہا تھا اور شفق کی سرخی کسی کے ارمانوں کے خون کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔

''گویا سورج بھی یہ اعلان کر رہا ہے کہ اب کوئی امید باقی نہیں رہی۔'' سارا نے سرد لہجے میں کہا۔ اس کی بات سن کر نسرین کی تشویش میں اضافہ ہو گیا لیکن اس نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

سورج دھیرے دھیرے اپنا اجالا سمیٹتا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سارا ماحول گہری تاریکی میں ڈوب جائے گا۔ اور پھر واقعی ہر طرف تاریکی چھا گئی۔ دونوں سہیلیاں کافی دیر تک اس اندھیرے میں بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ جہاں سارا کے لہجے میں مایوسی اور اَفسردگی تھی وہیں نسرین کی باتوں میں یقین اور حوصلے کی کھنک سنائی دے رہی تھی۔ اس نے سارا کو مایوسی کے دلدل سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی لیکن سارا کے دل میں امید کی کوئی لو روشن نہ ہو سکی۔

یکا یک آسمان پر ایک روشنی نمودار ہونا شروع ہوئی۔ یہ چاند تھا جو سورج کے ڈھلنے کے بعد روشن ہو رہا تھا۔ سورج کو ڈوبے ہوئے ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ایک نئی روشنی نے ماحول کو منور کر دیا۔ نسرین نے چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم اس کا مطلب سمجھتی ہو سارا؟ سورج غروب ہوا تو دنیا نے چاند سے اپنی بزم روشن کر لی۔ انسان کو کبھی مایوس اور نا امید نہیں ہونا چاہیے۔ قدرت ایک چیز لیتی ہے تو دوسری

عنایت کر دیتی ہے۔ ایک امکان جب ختم ہوتا ہے تو اسی وقت دوسرے امکان کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسی طرح افراد اور قوموں کے لیے بھی اُبھرنے کے امکانات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ انسان ایک مرتبہ قدرت کے آگے ناکام ہو جائے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ ناکامی کو اپنا مقدر مان لے۔ بلکہ وہ پرانی پرانی باتوں کو بھلا کر نئی زندگی کے آغاز کا سامان کر سکتا ہے۔''

شام اپنا آنچل سمیٹ کر جا چکی تھی۔ دونوں سہیلیاں کھلی چھت پر ہلکے سروں میں بہتی ہوئی ہوا میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ٹہل رہی تھیں۔ ادھر آسمان میں چاند روشن تھا اور ادھر سارا کے دل میں امید کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

◂◂ ● ▸▸

زخم زندگی

دور کہیں ایک گیت بج رہا تھا۔

وہ بھولی داستاں لو پھر یاد آ گئی.....

وہ اکیلی بیٹھی پریشان ہو رہی تھی تو تھکے ہارے قدموں سے لکڑی کے سہارے لڑکھڑاتے ہوئے گیلری میں آ بیٹھی تھی۔ آسمان میں لالی چھائی ہوئی تھی۔ سورج سمندر کی آغوش میں جانے کے لیے بیقرار تھا۔ پنچھی اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ رات کی کالی چادر پھیلنے لگی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

کئی سال گزر جانے کے بعد ایک درد ایک کسک سی کیوں ہے؟..... کیوں دل بے چین ہے، کیوں سکون نہیں؟ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ہنستا بچپن، کھلتی جوانی اور اب بے درد بڑھاپا۔ اکیلی، تنہا۔ نہ کوئی ہم درد نہ غم گسار۔ وہ سیڑھی سیڑھی اپنے ماضی میں اترتی چلی گئی۔

ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''شمع ارے او شمع!'' شاید والدین نے یہ نام بھی اسی لیے رکھا تھا کہ ساری زندگی جلتے رہنا ہے، پگھلتے رہنا ہے۔ آواز کانوں سے ٹکرائی تو اس نے جلدی سے کہا۔

''جی امی! ابھی آتی ہوں۔''

اس کا روز کا معمول تھا کہ فجر کی نماز ادا کر کے پڑھائی کرنے بیٹھ جاتی اور تب تک پڑھائی کرتی رہتی جب تک صبح کا اجالا نہ پھیل جاتا۔ شمع اپنی دھن میں لگی رہتی۔ پڑھائی کے بعد وہ اپنے کام میں مصروف ہو جاتی۔ گھر میں وہ سب کی لاڈلی تھی سبھی اس سے پیار کرتے تھے۔

وہ گھر کی بڑی بیٹی تھی جو شمع کی طرح روشنی بکھیرتی ہوئی اپنے معمول سے ہر دل عزیز بن چکی تھی۔

اس کی بالکنی سے سڑک پر چلتے پھرتے لوگ بھی دکھائی دیتے تھے۔ شمع کو پتہ بھی نہیں چلا کہ کب اور کیسے آتے جاتے ایک عادل نام کا شخص اسے دل سے پسند کرنے لگا تھا۔ وہ ان سب باتوں سے انجان تھی۔ اس بات کا پتہ تب چلا جب عادل نے اسے کالج کے گیٹ پر گلاب کا پھول دیتے ہوئے کہا کہ

''تم بہت خوبصورت ہو۔ میں تم سے پیار کرنے لگا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنا بناؤ گی، میرے پیار کو قبول کرو گی؟ مہربانی ہوگی۔'' شمع حیران و پریشاں ہو کر عادل کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے جسم سے ساری جان نکلی جا رہی ہے۔ اسے اپنے پیروں میں لرزش سی محسوس ہونے لگی۔ اس کے خاندان کا ماحول ایسا نہیں تھا۔ غیر مرد تو دور کی بات خاندان کے دوسرے لڑکوں سے بھی کھل کر بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ کافی دیر تک یوں ہی کھڑی رہی۔ پھر اس نے اپنی ہمت یکجا کر کے کہا۔

''آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہمارے گھر کا ماحول ایسا نہیں ہے۔ یہ بات اگر گھر والوں کو معلوم ہوگئی تو بہت برا ہوگا۔ آپ یہ خیال دل سے نکال دیں ورنہ بدنامی ہوگی۔''

''لیکن شمع کے لاکھ سمجھانے کے باوجود عادل نہ مانا۔ وہ روز ایک گلاب پیش کرتا اور اپنے پیار کی بھیک مانگتا۔ التجا کرتا کہ تم ایک بار ہاں کر دو۔ شمع بڑی الجھن میں رہنے لگی۔ کہتے ہیں کہ اگر پتھر پر بھی پانی کے قطرے لگاتار گرتے رہیں تو سوراخ ہو جاتا ہے۔ اب تو شمع کے دل میں بھی پیار کی جوت جلنے لگی تھی۔ اب وہ دونوں خوب مل کر گھومنے پھرنے جاتے۔ شمع کو عادل اس کے کالج سے پک اپ کر لیتا اور پھر وہ خوب مستی کرتے۔ دونوں پیار میں دیوانے ہو چکے تھے۔ اب ان کو روکنا ممکن نہیں تھا۔

لیکن یہ بات کب تک چھپی رہتی۔ گھر والوں کو پتہ چل چکا تھا۔ اب شمع کے ساتھ گھر والے سختی سے پیش آنے لگے۔ اس کا کالج جانا بھی بند کروادیا گیا۔ اب شمع گھر میں قید ہوگئی تھی۔

عادل نے شادی کے لیے رشتہ بھجوایا تھا لیکن شمع کے گھر والوں نے صاف انکار کر دیا۔ شمع نے بھی طے کرلیا کہ اب وہ زندگی پر کنواری رہے گی۔ جب وہ عادل کی نہ ہوسکی تو پھر کسی کی نہ ہوگی۔ کئی رشتے آئے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوگئی۔ وقت کس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ تو چلتا رہتا ہے۔ اور جب جس کا وقت پورا ہوجاتا ہے وہ دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے۔ شمع کے والدین بھی یکے بعد دیگرے رخصت ہوگئے۔ بھائیوں نے اپنا گھر بسالیا۔ بہنیں اپنے گھر کی ہوگئیں اور اس اجاڑ گھر میں شمع اکیلی رہ گئی۔

شمع اب بجھ رہی ہے۔ قطرہ قطرہ پگھل رہی ہے اور اسے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے اس کا وقت بھی ختم ہو رہا ہے اور وہ بھی یوں ہی پگھل کر ختم ہوجائے گی۔

◀◀ ● ▶▶

فیس بک کے سائیڈ ایفکٹ

صائمہ کا شوہر آصف ہمیشہ اس سے کہتا کہ موبائل کا حد سے زیادہ استعمال نقصان دہ ہوتا ہے۔ جس طرح بعض دواؤں کے سائیڈ ایفکٹ ہوتے ہیں اسی طرح اس جادوئی ڈبے کے بھی سائیڈ ایفیکٹ ہوتے ہیں مگر جادو تو جادو ہی ہے اور جادو بھی ایسا جو سر چڑھ کر بولے۔ وہ پوری طرح سے اس جادوگر کے بس میں ہوگئی تھی اور اسے اپنی ہر چھوٹی بڑی بات بتانا فرض سمجھتی تھی۔ کب کہاں گئی؟ کس کس پروگرام میں شرکت کی؟ کیا بنایا؟ کیا کھایا؟ غرض کہ کوئی ایسی خوشی نہ تھی جسے وہ شیئر نہ کرتی ہو۔

آج اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ آج بہت خوش تھی۔ اس کا شوہر آصف آفس جا چکا تھا اور وہ گزشتہ شب کے سرور میں ڈوبی سارے بکھرے ہوئے گفٹ کو سمیٹ رہی تھی۔ سبھی کو کھول کھول کر دیکھ رہی تھی اور دل ہی دل میں اپنی قسمت پر پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ جیسی میں نے قسمت پائی ہے اللہ سب کی ایسی ہی قسمت بنائے۔ ہر بیٹی قسمت والی ہو۔ اسے جی جان سے چاہنے والا ایسا شوہر ملے جو اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش کا احترام کرے۔ اسے وہ دن یاد آئے جب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ چھوٹی چھوٹی چیز کے لیے بھی ترستی تھی۔ آٹھ بھائی بہنوں میں اس کا نمبر چوتھا تھا۔ اپنے گھر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور اس کی خواہشات کو شاذونادر ہی پورا کیا جاتا تھا۔ اور موبائل کے لیے تو وہ ہمیشہ سے ترستی رہی تھی۔ اس کی ساری سہیلیوں کے پاس موبائل تھا جن سے وہ دن دن بھر کھیلتی رہتی تھیں اور یہ انہیں دیکھ دیکھ کر اداس ہوا کرتی تھی۔ لیکن خدا نے اس کے اندر صبر وضبط کا مادّہ دیا تھا اس لیے وہ

خاموشی کے ساتھ وقت کا انتظار کرتی رہی۔اور پھر وقت بدلا اور ایسا بدلا کہ قسمت سے اس کی ساری شکایتیں دور ہوگئیں۔اس کی شادی سافٹ ویئر انجینیر آصف سے ہوگئی۔آصف کے والدین گزر چکے تھے۔ بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ اپنے گھروں میں خوش تھیں۔صائمہ کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔وہ جیسے چاہتی رہتی۔ جو من میں آتا پکاتی۔جی بھر کے خریداری کرتی اور سال میں تین بار زبردست خوشیاں مناتی۔ایک تو اس کی میرج انیورسری اور پھر اس کی اور آصف کی سالگرہ۔میرج ی انیورسری اور سالگرہ کے موقع پر آصف اسے نہایت قیمتی تحفوں سے نوازتا اور آصف کی سالگرہ پر وہ اسے کوئی خوبصورت گفٹ دیتی۔

کل رات دونوں کی شادی کی سالگرہ تھی۔ آصف نے اسے ڈائمنڈ کا ایک خوبصورت نیکلس دیا تھا۔اور اسے اپنے ہاتھوں سے پہنایا تھا۔ابھی وہ گھر میں اکیلی تھی۔کام والی اپنا کام کر کے جا چکی تھی۔ اس نے الماری کھولی اور گزشتہ برسوں میں ملے سارے زیوروں کو نکال کر باری باری سے انہیں پہن کر خود کو آئینے میں نہارنی لگی۔خوبصورت گہنے خوبصورت عورت پر اپنی اصل بہار دکھاتے ہیں۔کہتے ہیں کہ نرگس نے جب پانی میں اپنا عکس دیکھا تو اپنی آنکھوں کو دیکھ کر اس پر ایسی محویت طاری ہوئی کہ سارے نظارے اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔وہ بھی ایک ٹک خود کو آئینے میں دیکھتی رہی اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئی۔

ابھی وہ اپنی دنیا میں گم ہی تھی کہ اچانک ڈور بیل کی زوردار آواز نے اسے چونکا دیا۔وہ آئینے سے باہر نکل آئی۔کون ہوسکتا ہے اس وقت؟ شاید کوئی مانگنے والی ہو یا پھر کوئی پڑوسن ملنے آئی ہو،اس نے جلدی سے سارے گہنے بیڈ پر بچھی چادر کے کونے کو اٹھا کر اس کے اندر رکھ دیے اور دروازے کی طرف بڑھی۔گھنٹی مسلسل بجے جا رہی تھی۔''کون ہے، کون ہے؟'' کرتی ہوئی وہ آگے بڑھی اور اس نے دھیرے سے دروازہ کھول دیا۔دروازہ کھلتے ہی

کچھ گنڈے ٹائپ لڑکے گھر کے اندر گھس گئے اور اس کی کنپٹی پر پستول سٹا کر کہنے لگے۔

''جتنے گہنے ہیں سب نکال۔'' صائمہ کا حلق خشک ہوگیا اور وہ مارے ڈر کے تھر تھر کانپنے لگی۔پستول والے نے اس کی کنپٹی پر ذرا دباؤ ڈالا تو وہ گھٹی گھٹی آواز میں کہنے لگی۔

''کون سے زیور، کیسے زیور؟ میرے پاس کوئی زیور نہیں ہے۔''

اس کی بات سن کر ایک گنڈہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

''کہتی ہے کہ کیسے زیور کون سے زیور۔ وہی زیور جو تجھے تیرے شوہر نے ہر برتھ ڈے اور میرج انیورسری بھی گفٹ کیے ہیں اور جن کی تصویریں لگا کر تو ہم جیسے غریبوں کا مذاق اُڑاتی ہے۔ ہماری بیویوں کو بھی ویسے ہی زیور چاہییں۔چل نکال جلدی نہیں تو اس پستول کی گولی ابھی تیرے بھیجے سے پار ہو جائے گی۔''

اس کا سر بہت زور سے چکرایا اور اس کے ذہن میں آصف کی کہی ہوئی بات گونجنے لگی۔

''ڈیئر! ہر بات کو فیس بک پر شیئر نہیں کرتے۔''

◀◀ ● ▶▶

رواج

اس گھر میں کُل چار عورتیں تھیں.....ایک اسّی برس کی بوڑھی اماں، ان کی بہو رقیہ بیگم، رقیہ بیگم کی بہو ثانیہ اور گھر میں کام کرنے والی بوا۔ رقیہ بیگم کے شوہر جمیل اور ان کا اکلوتا بیٹا راحیل سعودیہ میں جاب کرتے تھے۔ رقیہ بیگم اور ثانیہ تو اوپری منزل میں رہتی تھیں جبکہ بوڑھی اماں کو نیچے والے حصے کے ایک چھوٹے سے روم میں جگہ دے دی گئی تھی۔ بوا گھر کے کام کے علاوہ ان کی بھی خدمت کیا کرتی تھیں۔

کچھ عرصہ قبل تک وہ بہت چاق چوبند ہوا کرتی تھیں۔ وہ بہت اچھی خاتون تھیں اور پورے محلے میں بوڑھی اماں جی کے نام سے مشہور تھیں۔ وہ سب کی مدد کرنے والی اور سب کے درد کو سمجھنے والی تھیں۔ اپنے علاقے میں جھاڑ پھونک بھی کرتی تھیں۔ لوگوں کو ان پر بڑا اعتقاد تھا سو جب بھی کسی عورت کو ان کی ضرورت ہوتی ان کے پاس آجاتی۔ لیکن عورتوں کی جھرمٹ کے بیچ رہنے والی بوڑھی اماں جی آج بالکل اکیلی سی ہوگئی تھیں کیوں کہ ان کی بہو رقیہ بیگم کو یہ پسند نہ تھا کہ کوئی ان کی ساس کے پاس آکر بیٹھے اور ان سے بات چیت کرے۔ وہ بیچاری نیچے کے حصے کے چھوٹے سے روم پڑی رہتیں۔

رقیہ بیگم نے پورے گھر کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ اب وہی سفید وسیاہ کی مالک تھیں۔ ان کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ بوڑھی اماں کو اگر کسی چیز کی طلب ہوتی تو وہ اسٹیل کے گلاس کو ٹھک ٹھک کر کے آواز کرتیں تا کہ ان کی بہو سن لیں اور آکر ان کی مدد کریں اور وہ آتیں بھی ان کی ہر ضرورت پوری بھی کرتیں۔ بہو جب کھانا پکاتی تو پوچھتی امی جی، بوڑھی

اماں کے کے لیے کیا بناؤں؟ کبھی تو کھچڑی بنانے کے لیے کہتیں کبھی کہتیں کہ رہنے دو ایک چمچ تو کھچڑی کھاتی ہیں۔ دال میں ہی روٹی کھلا دونگی۔ بہو کہتی۔ اچھا امی! اور یہ کہ کر وہ چلی جاتی۔

نیچے سے کھٹ کھٹ کی آواز آئی تو ثانیہ نے کہا۔

''امی! امی!! بوڑھی اماں کو دیکھ لیں انہیں شاید کچھ چاہیے ہوگا۔''

انہوں نے کہا 'دیکھتی ہوں' اور یہ کہتے ہوئے وہ نیچے والے حصے میں چلی گئیں۔ رقیہ بیگم جب نیچے سے اوپر آئیں تو ان کا پارہ چڑھا ہوا تھا اور خود ہی خود بڑبڑا رہی تھیں۔ ثانیہ نے انہیں غصے میں دیکھا تو پوچھ بیٹھی۔

''کیا ہوا امی؟''

''ہونا کیا ہے؟ کہتے ہیں بچہ بڈھا ایک سمان ہوتا ہے۔ آج بڑی بی کا من گوشت پلاؤ کھانے کو ہو رہا ہے اور میٹھا پلاؤ اور حلوہ پوری بھی۔ اب بولو، نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ یہ سب کھا کر کچھ ہو ہوا گیا تو میں دنیا والوں کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ لوگ تو یہی کہیں گے کہ میں نے ہی انہیں مار ڈالا۔'' وہ غصے سے پیر پٹکتی ہوئی چلی گئیں۔

ادھر کچھ دنوں سے بوڑھی اماں کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ جب حالت کچھ زیادہ ہی بگڑ گئی تو جمیل میں کو خبر کی گئی۔ وہ فوراً جہاز پکڑ کر انڈیا آگئے۔ بوڑھی اماں کو فوراً اسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ تین دنوں تک وہ آئی سی یو میں رہیں۔ آخر چوتھے روز وہ دنیا کے جھنجھٹوں سے آزاد ہوگئیں۔

آج ان کا چالیسواں تھا اور رقیہ بیگم صبح سے ہی اپنی بہو کو ڈائریکشن دے رہی تھیں کہ کیا کیا پکانا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

''اماں جی کا چالیسواں ہے۔ پلاؤ گوشت پکانا ہے اور میٹھا پلاؤ بھی اور پوری حلوہ تو ضرور بنانا۔ وہ انہیں بہت پسند تھا۔ اس لیے اسے نہ بھولنا۔ سب پکا کر تیار رکھنا۔ میں غریب لوگوں

کو بلا لیتی ہوں۔انہیں بیٹھا کر کھلاؤں گی۔اس کا ثواب ان کی روح کو ملے گا،ایسا کہا جاتا ہے۔ہر سال یاد سے آج کے دن اچھا اچھا کھانا پکا کر غریبوں میں ضرور بانٹنا۔میری بات یاد رکھنا۔''

یہ ساری باتیں سن کر وہ حیران تھی کہ زندگی میں کھانا نہ ملے مرنے کے بعد ان کے نام کا کھانا ضرور کھلاؤ۔ یہ کون سا رواج ہے۔اس نے اپنے سر کو جھٹکا اور اپنے کام میں لگ گئی۔ساسو ماں اپنی بہو کو دیکھ رہی تھیں کہ بات تو سچ ہی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

نادانی

آج وہ انٹرویو دینے آئی تھی۔اس کی سہیلی نے کہا تھا وہاں چلی جانا دیکھو شاید وہ تمہاری کوئی مدد کر دیں۔ اپنی سہیلی کے کہنے پر وہ آ تو گئی تھی لیکن یہاں بہت دیر بیٹھنے کے بعد بھی اسے انٹرویو کا بلاوا نہ آیا تو وہ مایوس اور اداس ہوگئی۔اسے ایسا لگا جیسے امید کی ایک کرن جو سامنے آئی تھی وہ وقت سے پہلے ہی بجھ گئی ہو۔وہ بھاری قدموں سے واپس جانے کے لیے مڑی۔تبھی اس کا نام پکارا گیا۔اپنا نام سن کر جیسے اس کی امید کی شمع پھر سے جھلملانے لگی اور وہ تیز قدموں سے اندر داخل ہوئی۔سامنے کرسی پر ایک عمر رسیدہ انسان بیٹھے تھے۔انہوں اسے سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر خود ہی کہنے لگے۔

''اچھا تو آپ ہی رقیہ بی بی ہیں۔سلمٰی بٹیا نے بتایا تھا کہ آپ بہت مشکل میں ہیں۔آپ کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اور آپ کو کام کی سخت ضرورت ہے۔لیکن آپ تو کافی سن رسیدہ ہیں۔اس کمپنی میں تو آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ویسے میں لڑکیوں کا ایک ہوسٹل بھی چلاتا ہوں جہاں مجھے ایک کھانا بنانے والی کی ضرورت ہے۔کیا آپ کھانا بنا سکتی ہیں؟ آپ کی عمر کو دیکھتے ہوئے تو لگ رہا ہے کہ آپ کو کھانا بنانے کا کافی تجربہ ہوگا۔''

ان کی بات کا رقیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔اس کے کچھ نہ بولنے پر انہوں نے پھر سے پوچھا۔

''کیا ہوا آپ چپ کیوں ہیں؟ آپ کی عمر بھی تو کافی ہوگئی ہے آپ کے بال بھی سفید ہوگئے ہیں۔آپ کوئی اور کام بھی نہیں کر سکتی ہیں۔'' رقیہ چپ تھی۔وہ انہیں کیسے بتاتی کہ

اسے کھانا پکانا نہیں آتا ہے۔ کیسے بتائے حال دل؟ اس کے دل مں ایک درد سا اٹھا اور پھر یہ درد بڑھتا گیا۔ وہ کراہنے لگی۔ کمپنی کے ڈائیرکٹر صاحب اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئے اور انہوں نے اپنے آدمیوں کی مدد سے اسے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرادیا۔ وہاں ڈاکٹروں نے اس کا علاج شروع کیا۔ جب اس کے ہوش بحال ہوئے تو پرانی یادیں اسے تڑپانے لگیں۔ وہ تڑپ اٹھی اور اپنی دھندلی یادوں میں کھوگئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سارے منظر آنے لگے۔ وہ ان یادوں کو بھول چکی تھی لیکن وقت نے ایسی کروٹ لی کہ اسے سب کچھ صاف صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ ماضی کے دریچوں سے ایک آواز آتی ہوئی سنائی دی۔

''رقیہ کہاں ہو تم ؟ میں آفس سے آگیا ہوں۔ ذرا ایک گلاس پانی تو دینا'' جمیل نے پکار کر کہا۔ رقیہ نے صاف کہ دیا۔

''تم خود ہی پانی لے لو۔ میں کیا تمہاری نوکرانی ہوں؟''

رقیہ کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ وہ سسرال میں کوئی گھریلو کام کرے۔ دراصل وہ اپنے والدین کی لاڈلی تھی اور اس نے اپنے گھر میں کبھی کوئی کام کیا ہی نہیں تھا۔ اس بات کو لے کر ہمیشہ اس کی جمیل سے بحث ہو جاتی۔ سسرال والے اسے سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے لیکن اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ اپنی ضد میں رہتی۔ بے چارہ جمیل جیسے تیسے کر کے گزارا کر رہا تھا۔ اس نے بھی بہت سارے خواب سجائے تھے۔ اسی لیے تو اس نے گھریلو لڑکی سے شادی کی تھی لیکن یہ گھریلو لڑکی گھرداری کے کاموں سے نا آشنا تھی۔

جمیل روز دن کی کچ کچ سے تنگ آچکا تھا۔ رقیہ یہ بات سمجھنے کو تیار نہ تھی کہ گھر کا کام کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ یہ تو اچھی بات ہے۔ اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا عورتوں کو خدا نے بڑا اعلیٰ مقام عطا کیا ہے۔ وہ شوہر کا دل جیت کر جنت میں اپنا مقام بنا سکتی ہے۔ لیکن اسے ان باتوں

سے کوءسروکار نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا دن بدن جھگڑے بڑھنے لگے اور پھر بات اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ وہ جمیل سے لڑ جھگڑ کر اپنے مائکے آگئی۔ مائکے والوں نے بھی بہت سمجھایا پر وہ کسی کی سننے والی نہیں تھی۔ اپنی چند ہم خیال سہیلیوں کے ساتھ وہ کبھی وہ مورچا نکالتی، کبھی دھرنے پر بیٹھتی۔ کچھ سہیلیاں تو ساتھ دیتیں لیکن کچھ سمجھاتی بھی تھیں۔ لیکن وہ عورتوں کی آزادی کے نعرے لگاتی رہتی۔

ایک روز وہ دھرنے پر بیٹھی تھی کہ اس کا بھائی اسے بلانے آگیا۔ اس نے بتایا کہ امی کا انتقال ہوگیا ہے۔ بھائی کی بات سن کر اسے صدمہ تو ہوا لیکن پھر کہنے لگی۔

''میری امی گھر کا کام کرتے کرتے دنیا سے گزر گئیں۔ اب تو میں عورتوں پر ہو رہے ظلم وستم کے خلاف اور زور وشور سے آواز اٹھاؤں گی۔''

پھر ایک روز اس کے ابا بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بھائیوں اور بھابھیوں نے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ در بدر ہوگئی۔ وہ اپنی سب سے قریبی سہیلی کے ساتھ جا کر رہنے لگی۔ اس کی سہیلی نے اسے مشورہ دیا کہ کوئی کام پکڑ لے تاکہ دوسروں پر بوجھ نہ بنے۔ پھر اس نے کام کی تلاش شروع کی لیکن اب اس عمر میں اسے سوائے ملازمہ کے کوئی اور کام کیسے ملتا۔ کھانا بنانا وہ جانتی نہیں تھی۔ جھاڑو پونچھا اس نے کبھی کیا نہیں تھا۔ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں تھی۔ وہ اب اس دھرتی پر بوجھ تھی۔ اب اللہ کے سوا کوئی دوسرا سہارا نہیں تھا۔ وہ سسک سسک کر رونے لگی اور گویا خود کلامی کے انداز میں کہنے لگی

''کاش! میں پہلے اس بات کو سمجھ گئی ہوتی تو مجھ سے میرا گھر نہ چھوٹتا۔ میرا بھی شوہر ہوتا، بچے ہوتے۔ اور میں ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہوتی۔ کاش! کاش!!''

اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

◂◂ ● ▸▸

بدلہ

سنا تھا کہ کر بھلا ہو بھلا لیکن یہ کہاوت ایک دم اُلٹی پڑتی دکھائی دی۔ یہاں تو معاملہ ہی الٹا پڑ گیا۔ بہت پرانی بات ہے کسی گاؤں میں ایک مشہور حکیم صاحب رہا کرتے تھے۔ ان کا نام تو کچھ اور تھا لیکن بڑے حکیم صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ لوگوں نے انہیں گاؤں کا مکھیا بھی چنا تھا لیکن انہوں نے مکھیا کی کرسی کسی اور کو سونپ دی۔ لیکن سارا کام وہ خود ہی کیا کرتے تھے۔ گاؤں کے سارے مسائل کا حل وہ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ڈھونڈ لیا کرتے تھے۔ غریب لڑکیوں کی شادی کا معاملہ ہو یا گاؤں میں بجلی لانے کا، وہ ہر کام میں پیش پیش رہا کرتے۔ وہ بہت اونچے اور اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں ان کے والد صاحب نے حکمت کی تعلیم کے لیے لکھنؤ بھیجا تھا۔ وہ چاہتے تو وہیں بس جاتے لیکن انہیں اپنا گاؤں پیارا تھا اور وہ یہاں کے لوگوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنی پڑھائی پوری کرنے کے بعد یہیں اپنا مطب کھول لیا۔ اللہ نے ان کے ہاتھوں میں شفا دی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس علاقے میں مشہور ہو گئے اور دور دور سے لوگ ان کے پاس بغرض علاج آنے لگے۔ ان کا دل کشادہ تھا۔ غریبوں سے وہ پیسے نہیں لیتے تھے بلکہ اگر کوئی مریض ضرورت مند ہوتا تو اپنی جیب سے اس کی مدد بھی کر دیا کرتے تھے۔ اپنی لگن، محنت، ایمانداری اور خوش خلقی کی وجہ سے وہ پورے جوار کے چہیتے بن گئے تھے۔ ان کے مطب پر مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ ہر شخص ان پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کر لیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے کسی بچی کے لیے کوئی دوائی لکھ کر دی اور اس کی ماں سے کہا کہ اسے رات کو پانی کے ساتھ گھول کر پلا دینا۔ وہ گاؤں کی سیدھی سادی

عورت۔ اس کی سمجھ میں میں کچھ آیا کچھ نہیں آیا۔ اس نے نسخے کو ہی پانی میں گھول کر پلا دیا۔ دوسرے روز وہ عورت ان کے پاس خوش خوش آئی اور کہنے لگی کہ اب میری بچی بالکل ٹھیک ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ دوا کتنی بار دیا تھا؟ وہ کہنے لگی کہ میں نے تو کاغذ ہی کو گھول کر پلا دیا۔

گاؤں میں طرح طرح کے قصے ہوتے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ ہلّا ہوا کہ ارے وہ جو جمن کی بیوی ہے نا، وہ ماں بننے والی ہے۔ اب کیا تھا، سارے گاؤں والوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ لوگ چہ مگوئیاں کرنے لگے کہ اس کا شوہر تو باہر کام کرنے گیا ہوا ہے اور وہ سال میں صرف ایک بار یعنی عید کے موقع پر ہی گھر آتا ہے۔ تو پھر یہ عید گذرنے کے آٹھ مہینے کے بعد وہ کیسے پیٹ سے ہو گئی۔ پورے گاؤں میں چرچا ہونے لگی۔ لوگوں نے پتہ لگانا شروع کیا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ گاؤں کے لوگ بھی کمال کے ہوتے ہیں۔ بال کی کھال نکال لیتے ہیں اور سات پردوں میں چھپے ہوئے راز کو طشت از بام کر دیتے ہیں۔ بہت جلد لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ تو اچھن بابو کی دین ہے جن کے یہاں وہ کام کیا کرتی تھی۔۔ اب کیا ہونا تھا، لوگ دوڑے حکیم صاحب کے پاس اور لگے ان کے ہاتھ پاؤں جوڑنے کہ اب گاؤں کی عزت آپ ہی ہاتھ ہے۔ آپ کچھ ایسا کیجئے، کوئی ایسی دوا دیجئے کہ یہ ناجائز بچہ اس دنیا میں نہ آنے پائے۔ حکیم صاحب شریف اور نیک بندے تھے۔ ان کے دل میں اللہ کا خوف تھا۔ ان کے دل نے یہ گوارہ نہ کیا کہ کسی پیدا ہونے والے بچے کو دنیا میں آنے سے روک دیا جائے۔ وہ اس گناہ کے خیال سے ہی کانپ گئے اور انہوں نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے:

''میں یہ گناہ نہیں کر سکتا۔ بچے تو فرشتے ہوتے ہیں۔ کیا پتہ یہ بچہ پیدا ہونے کے بعد نیک اعمال کرے جس سے دنیا اور دنیا والوں کا بھلا ہو۔ کہتے ہیں کہ جو جیسا خود ہوتا ہے ویسا ہی دوسروں کو بھی سمجھتا ہے۔ حکیم صاحب چونکہ خود نیک اور شریف تھے اس لیے سبھوں کو

ایسا ہی سمجھتے تھے۔ بہر حال! اس عورت نے ایک بچے کو جنم دیا اور ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ اس کو دو بیٹیاں پہلے ہی سے تھیں۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ یہ لڑکا ناجائز ہے۔ لوگ اس کا مذاق اڑاتے۔ اس کی ماں لوگوں پر بگڑتی تو وہ زور زور سے ہنستے۔ پہلے تو اسے یہ سارا ماجرا سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن جب وہ کچھ بڑا ہوا تو اسے بھی اپنی اصلیت کا پتہ چل گیا مگر بجائے اپنے وجود پر شرمندہ ہونے کے وہ اسے اپنے لیے فخر کی بات سمجھتا تھا اور ویسی ہی حرکتیں کرتا تھا جو اس کی ذات پر صادق آتی تھیں۔ پڑھنے لکھنے سے تو اسے کوئی رغبت نہ تھی اور نہ ہی اس نے کوئی کام دھندا سیکھا تھا۔ بس دن بھر آوارہ گردی کرنا اور گاؤں کی بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کو خراب کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ ایک روز وہ کسی لڑکی کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تو گاؤں والوں نے اس کی جم کر دھلائی کر دی۔ وہ بھاگ کر کلکتہ چلا گیا۔ وہاں پتہ نہیں اس نے کیا کیا گل کھلائے۔ پھر ایک سال بعد وہ ایک لڑکی کو لیے گاؤں واپس آ گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک بے سہارا لڑکی تھی جو اس کے جال میں پھنس گئی تھی۔ اور وہ اسے بہلا پھسلا کر بغیر نکاح کیے اپنے ساتھ گاؤں لے آیا تھا۔ وہ یہاں کی زبان سے ناواقف تھی اور جب کوئی اس سے کچھ پوچھتا تو وہ حیران حیران نظروں سے اس کی طرف تکتی رہتی۔ گاؤں والوں کو ایک نیا مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا۔ پھر جب وہ یہاں کی بولی کچھ کچھ سیکھ گئی تب اس نے بتایا کہ وہ ایک غریب اور لاچار لڑکی ہے۔ اسے صمن نے طرح طرح کے سبز باغ دکھائے تھے۔ کہا تھا کہ اس کا گاؤں میں ایک بڑا مکان ہے۔ کافی کھیتی باڑی ہے لیکن یہاں تو غریبی اور بھک مری ہے۔ اب وہ کہیں جا بھی نہیں سکتی۔ لوگوں کو اس سے ہمدردی ہونے لگی اور اسے گھروں میں کام ملنے لگا۔ صمّن کچھ کرتا دھرتا تو تھا نہیں لیکن ہر سال بچے پر بچے پیدا ہو رہے تھے۔ بڑے حکیم صاحب کا انتقال ہو چکا تھا اور اب ان کے صاحبزادے حکیم سرور نے اپنے والد کی گدی سنبھال لی تھی۔ اسے سب سے زیادہ

تقویت حکیم صاحب کے گھر سے ملتی تھی۔ اس کی بیٹیاں بھی حکیم صاحب کے آنگن میں کھیل کود کر بڑی ہونے لگیں۔ صمّن کو اب ان لوگوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت تاڑی خانے میں گذرتا۔ خرچ کے پیسے وہ اپنی عورت سے مانگتا۔ وہ کہاں سے لاتی۔ بچیاں سیانی ہونے لگی تھیں اور انہیں اب عقل آنے لگی تھی۔ نوجوان لڑکوں سے پیسے اینٹھنے کا گُر انہیں آ گیا تھا۔ ماں باپ دونوں ان کی حرکتوں سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کیا کرتے تھے۔ والدین کی شہہ پا کر انہوں نے کھل کر کھیلنا شروع کیا اور گاؤں کے لڑکے ان کے جال میں پھنستے گئے۔ لیکن یہ سب درمیانی درجے کے لوگ تھے۔ صمن کی بڑی بیٹی بڑی چالاک اور عیار تھی۔ اسے کسی موٹے مرغے کی تلاش تھی تاکہ زندگی بھر کا سہارا ہو جائے۔ حکیم صاحب کا پوتا اختر شہر میں پڑھتا تھا۔ اس بار جب وہ گرمیاں کی چھٹی میں گھر آیا تو بڑی نے اس پر اپنا جال بچھانا شروع کیا۔ وہ دن دن بھر حکیم صاحب کے گھر پر رہتی۔ اختر سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی۔ ان کے لیے پانی بھرتی، ان کے کپڑے دھوتی، انہیں کھانا کھلاتی اور جب وہ چھت پر اپنے کمرے میں آرام کرنے جاتے تو ان کے پاؤں دباتی۔ بندہ بشر ہے۔ اختر میاں آخر کب تک اس کے شر سے بچتے۔ خیر وہ تو چھٹیاں منا کر شہر واپس ہوئے اور ادھر صمن بھی اپنی بیٹی کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اچانک ایک روز پورے گاؤں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ اختر نے پٹنہ میں بڑی سے نکاح کر لیا ہے اور ایک کرائے کا مکان لے کر اس کے ساتھ رہنے لگا ہے۔ کسی کو بھی اس خبر پر یقین نہیں آیا۔ اختر سے فون پر بات کی گئی تو وہ صاف مکر گیا اور کہنے لگا کہ یہ خبر بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ جب لوگوں نے صمن اور اس کی رکھیل سے اس بابت دریافت کیا تو ان لوگوں نے بھی اس سے انکار کیا لیکن یہ نہ بتا سکے کہ آخر بڑی گئی کہاں۔ لیکن بغیر آگ کے تو دھواں ہوتا نہیں ہے۔ ضرور دال میں کچھ کالا تھا۔ آخر جب

حکیم صاحب کے منشی نے شہر جا کر جب خود اپنی آنکھوں سے دونوں کو یکجا دیکھ لیا اور واپس آ کر پوری صورت حال بتائی تو سارے لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ پھر اسے منانے اور سمجھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن اختر بڑکی کے عشق میں پاگل ہو چکا تھا۔ وہ اسے چھوڑنے پر کسی طرح بھی راضی نہ ہوا۔ اب اس کی نظر میں ماں باپ بھائی بہن سب برے ہو چکے تھے۔ اس کے والد صاحب تو پہلے ہی دل کے مریض تھے۔ اب والدہ کو بھی دل کا عارضہ ہو گیا۔ بھائی بہن اس کے لیے الگ پریشان تھے مگر وہ اپنی دنیا میں مگن تھا۔ اختر کے گھر والے سوچتے کہ کاش بڑے حکیم صاحب نے ایک گناہ کر دیا ہوتا اور صمن کو اس دنیا میں آنے سے روک دیا ہوتا۔ یہ کیسی بھلائی تھی جس کا بدلہ برائی سے ملا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

بیٹی

فرزانہ بہت ہی خوبصورت تھی اس کے والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی والدہ ہی اس کے لیے سب کچھ تھیں۔ اور مالی وسائل نہ ہونے کے باوجود ماں نے اسے شہزادیوں کی طرح پالا تھا۔ جب وہ شادی کے قابل ہوئی تو اس کے لیے رشتے آنے لگے۔ اور پھر اس کی ماں نے ایک مناسب رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کر دی۔ اور پھر سال گزرتے گزرتے وہ ایک بیٹی کی ماں بن گئی۔ دستور زمانہ کے لحاظ سے اس کے شوہر اور سسرال والوں کو بیٹے کی چاہ تھی مگر قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ فرزانہ کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ بیٹی کی ماں بننے کے بعد سسرال میں اس کی قدر کم ہو گئی ہے۔ لیکن ہر ماں کی طرح اسے اپنی اولاد بڑی پیاری تھی۔ اور وہ اس پرورش میں جی جان سے لگ گئی۔

اگلی بار جب اس کے پیر بھاری ہوئے تو سسرال والوں نے وید، حکیم، ڈاکٹر سے لے کر پیروں اور فقیروں کی چوکھٹ تک کی دربانی کر ڈالی اور سب مل کر دن رات بیٹا ہونے کی دعا مانگتے رہے۔ اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس بار اسے بیٹا ہی پیدا ہوا۔ بس پھر کیا تھا۔ لوگوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا اور فرزانہ کی قدر و منزلت کچھ اور بڑھ گئی۔ اس کے بیٹے کو تو سبھی کا پیار مل رہا تھا لیکن بیٹی کو صرف ماں کے دامن میں ہی پناہ مل رہی تھی۔

دن، مہینے، سال گزرتے رہے اور اس دوران فرزانہ دو اور بیٹوں کی ماں بن گئی۔ اس عرصے میں اس کی ساس اور سسر یکے بعد دیگرے داغ مفارقت دے گئے۔ نندیں اپنے گھر کی ہو گئیں اور اب وہ سچ مچ اپنے گھر کی ملکہ تھی۔ لیکن امیر ہو یا غریب، راجہ ہو یا دکھ اور بیماری سب کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ فرزانہ بھی بیمار پڑ گئی اور پھر وہ دن بدن کمزور ہوتی ہے۔ فرزانہ کی بیٹی دُردانہ اب چودہ برس کی ہو

چکی تھی اور میٹرک کا امتحان دینے والی تھی۔ تینوں بیٹے ابھی نچلے درجوں میں تھے۔ شوہر کا بزنس بڑھ چلا تھا اور اب وہ اپنے کاروبار میں زیادہ مشغول رہنے لگے تھے۔ فرزانہ کی زندگی گھر اور ہسپتال کے درمیان گردش کرنے لگی تھی۔ کئی ڈاکٹروں سے اس کا علاج کروایا گیا۔ رنگ برنگے نسخے، طرح طرح کی دوائیاں اور ٹیسٹ.....لیکن ڈاکٹروں کا مقصد اب مریض کا علاج کرنا نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا ہو گیا ہے۔ کوئی شخص اگر ایک بار ڈاکٹر کے یہاں چلا گیا تو سمجھئے کہ وہ مکڑی کے جال میں پھنس گیا۔ فرزانہ بھی کسی مکھی کی طرح ڈاکٹروں کے جال میں پھنس کر پھڑ پھڑا رہی تھی۔

دُردانہ اپنی ماں کی حالت دیکھتی اور دل ہی دل میں کُڑھتی رہتی۔ اس نے میٹرک کا امتحان دیا اور امتیازی نمبروں سے اس نے کامیابی حاصل کی۔ جس دن اس کا رزلٹ ہوا وہ اپنی ماں کے پاس آئی اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پیار سے کہنے لگی۔

''امی! آپ گھبرائیے مت۔ میں پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بنوں گی اور آپ کا علاج خود کروں گی۔'' بیٹی کی بات سن کر فرزانہ کی آنکھیں ڈبڈبا اُٹھیں اور وہ اسے گلے سے لگا کر پیار کرنے لگی۔

آج فرزانہ کا گھر کسی شادی والے گھر سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ لوگوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ اس کے گھر میں مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ مبارکباد دینے والے اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی تحفہ بھی لے کر آئے تھے۔ آج فرزانہ نے میڈیکل کی پڑھائی پوری کر لی تھی اور وہ ڈاکٹر بن گئی تھی۔ فرزانہ بیڈ پہ پڑی ان سب کو آتے جاتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے دونوں گال بھیگ چکے تھے۔ دردانہ کی پیدائش کے وقت تو سبھی دکھی تھے لیکن آج سب خوش تھے۔ اور فرزانہ کو تو اصل خوشی اس بات کی تھی کہ اب اس کی بیٹی اس کا علاج خود کرے گی اور اس کے علاج سے وہ بہت جلد مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے گی۔

◀◀ ● ▶▶

چودھویں کا چاند

آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا تھا اور اس کی روشنی میں نیتا جی کی پوری حویلی روشن تھی۔ وہ خاندانی رئیس تھے۔ نام تو ان کا چودھری حشمت علی تھا لیکن وہ پورے علاقے میں نیتا جی کے نام سے مشہور تھے۔ اس زمانے میں کانگریس کا دور دورہ تھا اور انہوں نے اپنی جوانی میں ہی کانگریس پارٹی جوائن کر لی تھی۔ خدمت خلق کا جذبہ ان کے اندر شروع سے ہی موجود تھا گاؤں والوں کے ہر آڑے وقت میں وہ کام آتے تھے۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام شکیل تھا۔ خوبصورت اور صحت مند نوجوان تھا۔ بی۔اے پاس کرنے کے بعد نیتا جی نے اپنے اثر و رسوخ سے اسے پی ڈبلو ڈی میں نوکری دلوا دی تھی اور اب اس کے لیے کسی مناسب رشتے کی تلاش میں تھے۔ پرانے وقتوں میں لڑکی دیکھنے دکھانے کا رواج نہیں تھا۔ صرف ذات اور خاندان دیکھ کر شادیاں ہوا کرتی تھیں۔ ان دنوں رشتہ لگانے کے لیے ہر گاؤں میں ایک بوا ہوا کرتی تھیں۔ وہ آس پاس کے تمام علاقوں میں گھومتی رہتیں، کنوارے لڑکوں اور لڑکیوں کی مکمل معلومات حاصل کرتیں اور جوڑے بٹھاتیں۔ کام کا کام اور ثواب کا ثواب۔ اس وقت وہی بوا نیتا جی کی حویلی میں موجود تھیں اور کسی دوسرے گاؤں کے چودھری کی بیٹی کی منسوب لے کر آئی تھیں۔ پہلے تو انہوں نے لڑکی کے گھر اور خاندان کی تعریف بہت بڑھا چڑھا کر پیش کی۔ زمین جائیداد کی تفصیل بیان کی اور پھر یہ بھی بتایا کہ وہ بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ بواذرا دم لینے کے لیے رکیں تو نیتا جی کی بیوی پوچھ بیٹھیں۔

''اے بوا! یہ تو بتاؤ کہ لڑکی کی صورت شکل کیسی ہے؟ دیکھنے میں کیسی ہے؟''

بوا کو نیتا جی کی بیوی کا سوال ناگوار گزرا اور انہوں نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

''اے ہے بی بی! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، پچیس برسوں سے رشتے لگا رہی ہوں۔ آج تک کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا۔''

''پھر بھی، کچھ تو بتاؤ تا کہ کچھ اندازہ ہو سکے۔ ماشاءاللہ ہمارا بیٹا تو بہت خوبصورت ہے۔'' نیتا جی کی بیوی نے کہا۔ ان کی بات سن کر بوا کہنے لگیں۔

''ادھر آیئے بی بی!'' اور پھر وہ سب کو لے کر آنگن کی طرف چلیں۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ کیا ہے؟''

''چاند ہے اور کیا۔''

''تو بس بی بی! چاند نہ دیکھو اُس لڑکی کو دیکھو۔ بالکل چاند کی طرح ہے۔ دیکھئے گا تو جی خوش ہو جائے گا۔''

نیتا جی نے بھی اپنے طور پر چودھری صاحب کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں اور جب وہ ہر طرح سے مطمئن ہو گئے تو پھر منسوب طے ہو گئی۔ اور پھر زور و شور سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ سبھی لوگ بہت خوش تھے۔ اتنا اچھا رشتہ ہونے پر گھر والوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اس زمانے میں ایک مہینہ پہلے سے ہی گھر میں گیت شروع ہو جایا کرتا تھا۔ گاؤں کی عورتیں مہینہ بھر گیت گاتیں اور خوب انجوائے کرتیں۔ شادی کا دن قریب آتا تو رت جگا کی رسم ہوتی۔ رات بھر جاگ کر گلگلے بنائے جاتے تھے۔ پھر مانجا ہوتا تھا۔ اس دن سے جتنے رشتے دار ہوتے سب کی دعوت شروع ہو جاتی تھی اور پھر بارات جانے سے پہلے سارے گاؤں والوں کو دعوت دی جاتی اور پھر دوسرے روز بارات روانہ ہو جاتی۔ شکیل بھی بہت خوش

تھا اور اپنی آنے والی زندگی کے خوشنما خیال میں مگن تھا۔

نیتا جی کے گھر سے بارات نہایت دھوم دھام کے ساتھ نکلی۔ پورا گاؤں ہی باراتی بن کر جا رہا تھا۔ چودھری صاحب کے یہاں باراتیوں کا شاندار استقبال ہوا اور ان کے آرام و آسائش کا پورا پورا خیال رکھا گیا۔ نکاح کے بعد دولہا زنان خانے میں گیا اور دلہن کی رونمائی ہوئی تو دولہے کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بغیر کچھ کہے سنے چوکی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور تیزی کے ساتھ باہر نکل پڑا۔ دوستوں نے جب اسے اس طرح بدحواسی کے عالم میں باہر آتے دیکھا تو سب کے سب اس کے گرد آ کھڑے ہوئے اور سوال کرنے لگے۔

''کیا ہوا شکیل! اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

شکیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگا کر مسند پر بیٹھ گیا اور زور زور سے سانسیں لینے لگا۔ دوستوں کی فکر اور بڑھ گئی اور وہ کرید کرید کر اس سے پوچھنے لگے۔ خیر شکیل کے حواس جب ذرا بحال ہوئے تو اس نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ لڑکی اسے بالکل پسند نہیں آئی ہے اور وہ اسے رخصتی نہیں کرائے گا۔ یہ بات جب نیتا جی کے کانوں تک پہنچی تو وہ بوکھلا گئے۔ اتنا اچھا رشتہ پھر کہاں ملے گا۔ اعلیٰ خاندان، زمین جائیداد سبھی کچھ تو ہے۔ اگر لڑکی کی صورت میں ذرا کم ہے تو کیا ہوا۔ شادی کے بعد شکل وصورت کی اہمیت ویسے بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر لڑکی اچھے اخلاق کی ہوگی تو سب ٹھیک ہو جائے گا،

سب لوگ شکیل کو سمجھانے بجھانے لگے۔ اس کا دل تو نہیں مان رہا تھا لیکن خاندان کی عزت کا خیال کرتے ہوئے اس نے بے دلی کے ساتھ بزرگوں کی بات مان لی اور اس طرح دلہن رخصت ہو کر سسرال پہنچ گئی۔ لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی شکیل کی ناراضی کی خبر وہاں پہنچ چکی تھی۔ گاؤں کی عورتیں یہ جاننے کے لئے بیتاب تھیں کہ جس لڑکی کے حسن کی

تعریفیں ہورہی تھیں وہ دولہے کو کیوں پسند نہیں آئی۔خدا خدا کر کے دلہن کا ڈولا دیوڑھی پر اترا اور پھر بہت ساری رسموں کے بعد اسے گھونگھٹ میں چھپا کر اندر لے جایا گیا۔پورے گھر میں عورتیں ہی عورتیں بھری ہوئی تھیں۔دالان میں،آنگن میں اور کمروں میں ہر طرف ان کے بولنے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ان عورتوں میں رشتہ لگانے والی بوا بھی تھیں۔خیر جب عورتوں کے اصرار پر دلہن کے چہرے سے گھونگھٹ اُٹھایا گیا تو سبھی کی آنکھیں پھیل گئیں۔اور پھر وہ سب آپس میں کھسر پھسر کرنے لگیں۔شکی کی امی جواب تک صدمے سے دو چار چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھیں اچانک اُٹھ کھڑی ہوئیں اور بوا سے مخاطب ہوکر زور سے بولیں۔

''بوا! تم تو کہتی تھیں کہ لڑکی چودھویں کا چاند ہے تو پھر اس کے چہرے پر یہ داغ دھبے کیسے ہیں۔''

بوا نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

''اگر میں نے لڑکی کو چودھویں کا چاند کہا تھا تو اس میں غلط کیا تھا۔جس طرح چاند میں داغ ہوتا ہے اسی طرح لڑکی کے چہرے میں بھی داغ ہے۔ویسے لڑکی بہت مہذت اور شریف ہے۔

◂◂ ● ▸▸

دو دوست

دونوں کے دوستی کے چرچے سارے شہر میں تھے۔ان کی دوستی ہی اتنی گہری تھی کہ لوگ اپنے دانتوں تلے انگلیاں دبا لیتے تھے۔ہاں سچ ہی کہا ہے کسی نے دوستی دل سے کرنی چاہیے نہ کہ ذات پات سے نہ ہی اونچ نیچ سے اور نہ ہی امیری غریبی سے۔ایسی ہی دوستی مثال بن جاتی ہے۔شگفتہ اسکول پہنچتے ہی اپنی دل کی دھڑکن،دلوں میں بسنے والی دوست ماریا کو ڈھونڈنے لگتی جیسے لگتا وہ اسکول تو صرف اسی لیے ہی آتی ہے تاکہ وہ اس سے ڈھیر ساری باتیں کرے اور خوب مستی کرے۔جب پڑھنے کی بات آتی تو اس کی دوست تھی ہی اس کی مدد کے لیے۔شگفتہ کو فخر تھا اپنی دوستی پر لیکن یہ بات دونوں کے والدین کو بالکل پسند نہ تھی کیوں کہ شگفتہ ایک امیر باپ کی بیٹی تھی اور اس کی دوست ماریا نہایت غریب تھی لیکن پڑھنے میں اتنی تیز کہ سب کو پیچھے چھوڑ آگے نکل جاتی۔شگفتہ ماریا کے سہارے ہی اسکول ٹاسک بناتی اور وہ دونوں خوب انجوائے کرتیں۔ ھومنے جاتیں اور کبھی چاٹ تو کبھی گول گپے کھاتیں۔یہ بات بھی شگفتہ کے گھر والوں کو پسند نہ تھی لیکن ان دونوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لوگ لاکھ باتیں بناتے لیکن ان کی دوستی میں کوئی فرق نہ پڑا تھا اور نہ پڑیگا.....ایسا لگتا تھا۔

امتحان ختم ہوتے ہی شگفتہ نے پلان بنایا پارٹی کرنے کا۔کسی ریسٹورنٹ میں جا کر من پسند چیز کھانے کا۔ماریا بھی اس کی ضد کے آگے ہار جاتی۔وہ تیار ہوگئی۔پھر کیا تھا امتحان ختم ہوا اور شگفتہ کار لیکر ماریا کے گھر پہنچ گئی۔کچھ دیر ماریا کے گھر پر رک کر دونوں نکل گئیں گھومنے پھرنے۔ماریا کے والدین نہیں چاہتے تھے کہ اس کی بیٹی ان امیروں کے چکر میں پڑے۔پتہ نہیں کب وہ ماریا کی دوستی کو ٹھکرا دے اور ماریا کو تکلیف پہنچے لیکن وہ لوگ کر بھی کیا سکتے تھے۔

شگفتہ اور ماریا نے خوب کھایا پیا اور گھر کی طرف چل دیں۔ ماریا کو اس کے گھر چھوڑ کر شگفتہ اپنے گھر چلی گئی۔ اس کے والد انتظار میں بیٹھے تھے کہ آج تو خوب خبر لونگا اور وہی ہوا۔ شگفتہ کے گھر پہنچتے ہی اس کے والد نے بہت سمجھایا اور کہا۔

''دیکھو شگفتہ! تم سنبھل جاؤ۔ ان غریب لوگوں سے دوستی اچھی نہیں۔ دوستی برابر والوں سے کی جاتی ہے۔ تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ پتہ نہیں اس لڑکی ماریا میں ایسا کیا ہے کہ تم کو اس کا ہی ساتھ اچھا لگتا ہے۔ نہ جانے تم سے وہ کب پیسے کا مطالبہ کر دے، تم سے کیا مانگ لے۔ تمہارے پاس تو سب کچھ ہے۔ اس غریب کے پاس کیا ہے؟ یہ لوگ جان بوجھ کر امیر لڑکیوں سے دوستی کر لیتی ہیں تاکہ ان سے وقت پڑنے پر اپنا کام کروایا جائے۔'' شگفتہ کو یہ باتیں بالکل پسند نہ آئیں۔ وہ اپنے والد سے کہنے لگی۔

''پاپا! ماریا ایسی نہیں ہے وہ پیسے کی لالچی نہیں۔ وہ پڑھائی میں بھی میری مدد کرتی ہے،'' لیکن انہوں نے شگفتہ کی ایک نہ سنی اور اسے سختی سے منع کیا کہ آج کے بعد وہ ماریا سے نہیں ملے گی۔ شگفتہ اداس ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شگفتہ کے پاپا کو یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ یہ ساری باتیں کوئی اور بھی سن رہا ہے۔ وہ ماریا تھی۔ وہ آئی تھی شگفتہ کا کوئی سامان دینے جو اس کے گھر میں چھوٹ گیا تھا لیکن ماریا کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہاں اسے یہ سب سننے کو ملے گا۔ یہ سب باتیں سن کر اس کے دل کو بہت تکلیف پہنچی۔ اس نے بھی ارادہ کر لیا تھا کہ اب وہ شگفتہ سے کبھی نہیں ملے گی۔

دونوں نے اپنی اپنی راہ پکڑ لی تھی۔

ایک دن اچانک ماریا کے والد کی طبیعت بہت خراب ہو گئی اور انہیں ہاسپٹل میں ایڈمٹ کیا گیا۔ ڈاکٹر نے ماریا سے کہا کہ اگر ان کی جان بچانی ہے تو ایک لاکھ روپیہ کا

بندوبست کرو۔ میں آپریشن کی تیاری شروع کرتا ہوں۔ ماریا یہ سن کر پریشان ہو گئی۔ کہاں سے اتنے پیسوں کا انتظام ہوگا؟ وہ کوشش کرتی رہی۔ لیکن وہ کچھ ہی پیسوں کا انتظام کر پائی۔ جب وہ ہاسپٹل پہنچی تو ڈاکٹر نے کہا آپ کے والد کا آپریشن ہو گیا ہے۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ جلد ہی انہیں ہاسپٹل سے چھٹی مل جائے گی۔ ماریا یہ سب سن کر حیران رہ گئی۔ جب پیسوں کا انتظام ہوا ہی نہیں تو پھر آپریشن کیسے ہو گیا۔ اس نے ڈاکٹر سے پوچھنا چاہا مگر اسے پھر یہ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے ڈاکٹر نے جذبۂ انسانیت کے تحت اس کے والد کا آپریشن مفت میں کر دیا ہو۔

اس واقعے سے ماریا کو بڑی شرمندگی محسوس ہوئی اور اس نے طے کر لیا کہ وہ خوب پڑھے گی اور پڑھ لکھ کر کوئی اعلیٰ افسر بنے گی۔ پھر وہ لگ گئی اپنی پڑھائی میں اور آخر کار اس کی محنت رنگ لائی اور وہ کلکٹر بن گئی۔

ایک روز ایس پی صاحب نے اسے اپنے گھر پر دعوت دی۔ جب وہ ان کے کوارٹر پہنچی تو اس نے وہاں شگفتہ کو دیکھا۔ معلوم ہوا کہ وہ ایس پی صاحب کی وائف ہے۔ ماریا ابھی تک اپنی بے عزتی کو نہیں بھولی تھی۔ وہ فوراً واپسی کے لیے مڑ گئی۔ شگفتہ اسے روکتی رہ گئی مگر وہ نہ رکی۔

ایک روز ماریا کی طبیعت خراب ہوئی تو وہ اسی ڈاکٹر کے یہاں گئی جہاں اس کے والد کا علاج ہوا تھا۔ وہاں شگفتہ بھی چیک آپ کے لیے آئی ہوئی تھی۔ ماریا نے شگفتہ کو دیکھ کر اپنا منھ پھیر لیا۔ ادھر ڈاکٹر نے ماریا کو دیکھتے ہی اس کے والد کی خیریت پوچھی اور پھر اس نے شگفتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہی وہ خاتون ہیں جنہوں نے آپ کے والد کے آپریشن کی فیس جمع کی تھی اور وہ ٹھیک ہو گئے تھے۔ ماریا یہ سن کر دنگ رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔ اس نے فوراً شگفتہ کو گلے سے لگا کر اپنی دوستی کو یاد کیا اور قسم کھائی کہ اب وہ یہ دوستی نہیں توڑے گی۔

◀◀ ● ▶▶

موبائل کی لت

اس کی بے چینی بڑھتی ہی جارہی تھی۔ وہ خود بھی سمجھ نہیں پارہی تھی کہ اسے ہوا کیا ہے؟ وہ پریشان ہوکر خدا سے کہتی کہ یا خدا! مجھے یہ کیا ہوگیا ہے؟ میں کیا کروں کہ مجھے چین آجائے اور سکون قلب حاصل ہو۔ لیکن اس کی بیماری تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔ کسی سے بات بھی تو نہ ہو پا رہی تھی۔ کہیں سے کوئی خبر بھی نہیں آرہی تھی۔ اس کے یہاں ٹی وی بھی نہیں تھی کہ جس سے وہ اپنا دل بہلاتی۔ سیدھی سی زندگی جی رہی تھی۔ اسے اپنے گھر میں ہزاروں کام رہتے۔ وہ اپنے کام میں لگی رہتی۔ ہر کام کو ڈھنگ اور سلیقے سے کرنا اسے بہ خوبی آتا تھا۔ بہت سارے رشتے داروں نے اس سے سوال کیا تھا تم دن بھر کرتی کیا ہو؟ دل کیسے لگتا ہے تمہارا؟ یہ سوال اسے چبھ جاتا اور وہ کہہ دیتی کہ میرے ساتھ چلیں اور پھر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ وقت کیسے نکل جاتا ہے۔ اسے لگتا کہ اگر اور وقت مل جاتا تو وہ اپنے موبائل میں مزاحیہ ریل اور شارٹ ویڈیو دیکھ لیتی لیکن وقت کم تھا اور کام زیادہ۔ اب تو وہ افسانے بھی لکھتی تھی۔ اس کے گھر میں تین پیپر آتے تھے، انقلاب، قومی تنظیم اور پربھات خبر۔ صبح کی چائے کے ساتھ انہیں پڑھ لینا ضروری ہوتا کیونکہ بغیر اخبار پڑھے اسے چین ہی نہ آتا تھا۔ وہ وقت کی پابند تھی اور اپنا ہر کام وہ وقت پر کرنا خوب جانتی تھی۔ اس کے شوہر ریٹائرڈ پروفیسر تھے جو پرنسپل کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ وہ وقت کی اس قدر پابندی کرتے تھے کہ کالج والے شائد گھبراتے ہونگے۔ کالج پہنچتے ہی کالج میں گویا کورٹ مارشل لگ جاتا۔ کون آیا کون نہیں۔ کیا کام ہوا کیا نہیں ہوا؟ کالج کے سارے اسٹاف ڈرے اور سہمے رہتے تھے اور گھر میں بھی وہی حال تھا۔ وقت پر نماز، وقت پہ کھانا نہانا۔ چائے ناشتہ سبھی کا وقت

بندھا ہوا تھا۔ سوئی کا کانٹا ادھر سے ادھر نہیں ہوسکتا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے باضابطہ فری کوچنگ کلاس شروع کیا۔ مجال ہے کوئی اسٹوڈنٹ ایک منٹ بھی آگے یا پیچھے ہوجائے۔ سب کو وقت کی اہمیت معلوم ہوگئی تھی۔ اور سبھی اسٹوڈنٹ وقت پر حاضر ہوجاتے تھے۔ گھر کا ماحول اتنا مصروف ہونے کے باوجود بھی وہ بے چین تھی۔ اسے کیا ہوا تھا وہ خود بھی یہ نہ سمجھ پارہی تھی۔ ڈاکٹر بھی پریشان تھے۔ ساری رپورٹیں بھی ٹھیک تھیں۔

ایک دن اس کی گھبراہٹ اتنی بڑھ گئی کہ وہ اپنے شوہر کو کہنے لگی مجھے کسی دوسرے ڈاکٹر سے دکھادیں۔ میری طبیعت بہت خراب لگ رہی ہے۔ اس کے شوہر نے کہا، اچھا میں ایک اچھے ڈاکٹر کو جانتا ہوں۔ ان کا اپائنٹمنٹ لے لیتا ہوں۔ پھر چل کر دکھادونگا۔ شام میں دونوں ڈاکٹر کے یہاں پہنچ گئے۔ نمبر آنے پر ڈاکٹر نے اسے دیکھا۔ ساری رپورٹیں بھی دکھائیں۔ ڈاکٹر نے کہا انہیں تو کچھ نہیں ہوا ہے۔ لگتا ہے ان کی کوئی قیمتی چیز گم ہوگئی ہے، جو ان کے آس پاس رہتی تھی۔ اس چیز سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ وہ چیز کیا ہے؟ پھر جیسے ڈاکٹر کو کچھ خیال آیا اور وہ اچانک پوچھ بیٹھا۔

''آپ کا موبائل کہاں ہے؟'' اس نے جواب دیا۔

''میں نے موبائل سے دوری بنالی ہے. پہلے زمانے میں جیسے پہلے لوگ رہتے تھے میں بھی ویسے ہی جینا چاہتی ہوں۔''

ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''پر اب آپ اس کے بغیر جی نہیں پائیں گی۔ جایئے موبائل ریچارج کروائیں۔ آپ ٹھیک ہوجائیں گی۔''

◀◀ ● ▶▶

ساون کی یادیں

وہ اپنی بالکنی میں بیٹھی گھر کے سامنے کے خالی پلاٹ پر اس ہریالی کو دیکھ رہی تھی جو ساون کی بوندوں سے خود بخود اگ آئی تھی۔ اس ہریالی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ٹھنڈک پہنچ رہی تھی۔ اس کا روز کا معمول تھا کہ عصر کی نماز پڑھ کر دن بھر کی تھکن اتارنے کے لیے بالکنی میں بچھی کرسی پر بیٹھ جاتی اور شام کا نظارہ کرنے لگتی۔ بارش کی بوندوں نے اس پلاٹ کو ہریالی میں تبدیل کر دیا تھا اس میں جانے کتنے پیڑ پودے اگ آئے تھے۔ کھیرا، تربوز، کریلا، آم اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ سب دیکھ کر اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ یہ قدرت کا کمال تھا کہ بغیر کسی محنت اور دیکھ بھال کے پودے نہ صرف نکل آئے تھے بلکہ پھل پھول بھی رہے تھے۔ ان پودوں پر نظریں جمائے وہ تیس سال پیچھے کی دنیا میں پہنچ گئی۔ اسے برسات کا موسم بڑا سہانا لگتا تھا۔ ساون بھادوں کا مہینہ بڑا دلچسپ ہوتا تھا۔ پرانی باتیں، پرانے لوگ پرانے رسم ورواج سب کی سب پرانی یادیں بن کر رہ گئیں ہیں۔

وہ اس وقت بہت چھوٹی تھی اور پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ اس برس کافی بارش ہوئی تھی۔ لگاتار بارش ہونے کی وجہ سے اس کا اسکول ناغہ ہو رہا تھا۔ ایک روز موسم کچھ ٹھیک تھا لیکن اسکول پہنچتے ہی جو بارش شروع ہوئی تو خوب ہوئی۔ جب اسکول کی چھٹی ہوئی تو سبھی بچے اپنے اپنے گھر جانے لگے لیکن آگے کی سڑک پر نہر کا پانی بہ رہا تھا۔ کچھ بچے اسی بہتے ہوئے پانی میں یہ سوچ کر اتر گئے کہ پار نکل جائیں گے۔ لیکن پانی کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ وہ بچے اس میں بہنے لگے۔ بچوں کی چیخ پکار سن کر کچھ لوگ دوڑ کر آئے اور ان بچوں کو بچا لیا گیا۔ اس روز تو سبھی اپنے اپنے گھر پہنچ گئے لیکن پھر ان کا اسکول جانا اس وقت تک کے لیے بند کرا دیا گیا جب تک

کہ راستہ ٹھیک نہیں ہو جاتا۔ ادھر بارش تھی کہ لگاتار ہو رہی تھی۔ بچوں کو گھر میں ہی مزہ آ رہا تھا۔ گھر کے آنگن میں جب پانی بھر جاتا تو سبھی بھائی بہن پانی میں ناؤ بنا کر ڈالتے اور اپنی اپنی ناؤ کے کنارے لگنے کا انتظار کرتے۔ جب خوب بارش ہوتی کھیتوں میں روپنی کا کام شروع ہو جاتا اور کھیتوں میں وہ ہریالی ہو جاتی کہ دیکھتے ہی بنتا۔

آج صبح سے ہی امی کام میں لگی ہوئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ رمضان ہو۔ وہ پوچھتی، امی ابھی رمضان تو نہیں ہے پھر اتنی تیاریاں کس لیے ہو رہی ہیں؟ کیا ہونے والا ہے؟ امی کہتیں شام ہوگی تو پتہ چل جائیگا جاؤ پڑھائی کرو۔ پتہ نہیں ہر ماں یہ کیوں چاہتی ہے کہ اس کا بچہ ہر وقت پڑھتا ہی رہے۔ خیر! بچے سب پڑھائی میں مشغول ہو گئے۔

شام ہو گئی تھی اور امی کام میں لگی ہوئی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ گاؤں کی کچھ اور عورتیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی فنکشن ہے۔ گھر میں ہر طرف چہل پہل تھی۔ خالص دودھ میں کھیر بنی تھی۔ اس زمانے میں گھر میں ہی گائے ہوا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ چنے کی گھونگھنی، پکوڑی، کڑھی، باسمتی چاول کا پلاؤ مٹن قورمہ وغیرہ۔ پھر یہ ساری چیزیں قریبی لوگوں کے گھر بھیجی گئیں۔ بچوں کو تو تماشا دیکھنے میں مزہ آ رہا تھا۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔

شام ڈھلنے والی تھی۔ مغرب سے پہلے سبھی مزدور لوگ گھر میں داخل ہونے لگے۔ ساری عورتیں مرد سب گھر میں تھے۔ کچھ مرد مزدور گھر چلے گئے تھے۔ ان کی عورتیں آئی تھیں۔ سب آنگن میں بیٹھی ہوئی تھیں اور کچھ اپنی بھاشا میں گیت گا رہی تھیں۔ ان کو گھر میں کام کرنے والی سلیمن بوا سندور کی ڈبی دے کر کہتی لگا دو سب کو اور ایک کٹوری میں تیل بھی دیا گیا سر میں لگانے کو۔ وہ لوگ اپنے اپنے برتن لیکر آئی تھیں۔ پھر ان لوگوں کو وہ سارے پکوان دئے گئے جو اس روز بنے تھے۔ وہ عورتیں بہت خوش تھیں۔ پھر آئی ان کے دن بھر کی مزدوری کی بات.....

ارے من کمنا، سورجو، چنارک، مگیر، سغیر سب آؤ ادھر، کوٹھی کا منہ کھولو۔ سو من چاول رکھنے والی اینٹ اور سیمنٹ سے بنی کوٹھی پہلے ہر زمیندار کے گھر میں ہوا کرتی تھی۔ سب اکٹھا ہو گئے۔ کوٹھی کا منہ کھلتے ہی چاول باہر گرنے لگا۔ تب دن بھر کی مزدوری ۵ کیلو چاول ہوا کرتی تھی۔ اب تولنا شروع ہو گیا تھا۔ چنارک نے تول شروع کیا اور باری باری سے سب کو دینے لگا۔ سبھی مزدور عورتیں اپنی مزدوری لے کر گھر کو جا رہی تھیں۔ ایک ایک کر کے سبھی اپنی مزدوری لے کر جا چکی تھیں۔ تب جا کر امی نے بھی چین کی سانس لی اور گھر کے سبھی لوگوں کو بھی وہ سارے آئٹیم کھانے کو ملے۔ سبھی مزے لے کر کھانے لگے۔ اس نے امی سے پوچھا۔ یہ کیا ہو رہا تھا؟ آج کیا تھا ہمارے گھر میں؟ امی نے بتایا آج پہرو پنا تھا۔ ہمارے گھر میں جب ساون آتا ہے تو یہ بارش کے موسم میں منایا جاتا ہے۔ کھیتوں میں جب پانی بھر جاتا ہے تب دھان کی روپنی ہوتی ہے اور پھر کھیت لہلہاتے ہیں۔ جب سب کھیتوں میں روپا ہو جاتا ہے تو ہریالی ہی ہریالی ہوتی ہے چاروں طرف۔ اس کا گھر سب سے آخر میں تھا تو سارے کھیت دکھائی دیتے۔ اور فصل پک جانے کے بعد اس کی کٹائی ہوتی ہے۔ یہ کسانوں کی محنت کا پھل ہوتا ہے۔

◀◀ ● ▶▶

شہزادی

آج وہ بہت خوش تھی۔۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اسے نئی زندگی مل گئی ہو۔ اگر اس کے پنکھ ہوتے تو تو وہ ہواؤں میں اُڑتی پھرتی اور ایک ایک کو بتاتی کہ آج وہ بے حد خوش ہے۔ مگر جب آئینہ میں اسے اپنے جلے ہوئے گال دکھائی دیے تو وہ اس مورنی کی طرح ہو گئی جو اپنے پیر دیکھ کر اداس ہو جاتی ہے۔

وہ گاؤں کی ایک عام سی سیدھی سادی لڑکی تھی لیکن اس کا باپ اسے شہزادی کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ گھر کی بڑی بیٹی تھی۔ ماں باپ کی لاڈلی تھی۔ اس کی کئی سہیلیاں بھی تھیں۔ ہنس مکھ تھی اور اسے بتولے بازی کرنا بھی خوب آتا تھا، اور شاید اسی لیے سب کی چہیتی تھی۔

وہ کھلی فضا میں زندگی گزارنے والی لڑکی تھی۔ دکھ تکلیف اور پریشانیوں سے کوسوں دور۔ اس کے باپ کے پاس کچھ زمین تھی جس سے پورے گھر کا گزارا ہوتا تھا۔

اب وہ بڑی ہو رہی تھی لیکن الہڑ پن اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آج اس کی ایک سہیلی کی شادی تھی۔ وہ خوب سج دھج کر گئی تھی۔ سب کی نظریں اسی پر رک رہی تھیں۔ اس کے بھی رشتے آ رہے تھے۔ بس فائنل کرنا باقی تھا۔ اس کی سہیلیاں بھی اسے چھیڑ رہی تھیں۔ لیکن اسے تو دلہن بنی اپنی سہیلی کی قسمت پہ رشک آ رہا تھا۔ کیا شاندار دولہا ملا ہے۔ گھر خاندان بھی بہت اعلیٰ ہے۔ وہ بھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

شادی میں شرکت کرنے کے بعد جب وہ گھر آئی تو اسے یہ فکر ہونے لگی کہ نہ معلوم اس کی شادی کہاں ہوگی، کس سے ہوگی؟ ہونے والا شوہر کیسا ہوگا؟''

کچھ ہی دنوں میں اس کی شادی بھی طے پا گئی۔ گھر میں شادی کی گہما گہمی شروع ہو گئی۔ اسے بتایا گیا کہ لڑکا کلکتہ میں کام کرتا ہے۔ گاؤں میں کھیتی ہے۔ شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ وہ بڑی بیٹی تھی گھر خاندان کی۔ اس کے باپ سے جو ہو سکا جہیز دے کر خوشی خوشی بیٹی کو وداکیا۔ سب کچھ دے سکتا ہے بیٹی کا باپ لیکن اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے وہ یہ نہیں جانتا۔

وہ سسرال آ گئی تھی۔ گاؤں کا رہن سہن کچھ الگ ہی تھا۔ یہ ایک جوائنٹ فیملی تھی۔ پانچ بھائی اور ان کی بیویاں اور بچے سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ ہر ایک پاس ایک کمرہ اور دالان کا ایک حصہ تھا۔ ہر بہو اپنے کمرے کے سامنے والے دالان میں کھانا پکاتی تھی۔ بیچ میں آنگن تھا جو سب کا سانجھا تھا۔ وہ پانچوں بہوؤں میں سب سے چھوٹی تھی۔ اس کے شوہر پر اس کی بھابھیوں کا سکّہ جما ہوا تھا۔ وہ سبھوں کا دلارا تھا۔ بھابھیاں جو کہتیں اس کا شوہر وہی کرتا۔ یہ سب دیکھ دیکھ کر اس کا دل کڑھتا مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

شادی کے کچھ ہی دنوں بعد اس کا شوہر کلکتہ چلا گیا۔ وہ گھر کا سارا کام کرتی۔ پورے گھر میں جھاڑو لگانے کی ذمہ داری اسے سونپ دی گئی۔ اور سبھوں کے کپڑے دھونے کا کام بھی اسی کے سر آ گیا۔ وہ خوش اخلاق بھی تھی اور پورے گاؤں والوں سے ہنس ہنس کر ملتی تھی۔ جلد ہی پورا گاؤں اس کا گرویدہ ہو گیا۔ اس کی جیٹھانیوں کو یہ بات ہضم نہیں ہوئی اور وہ اسے ہر وقت طعنے دینے لگیں۔ مگر وہ ان کی باتوں کو سن کر چپ چاپ برداشت کر لیا کرتی تھی۔

وقت گزرتا گیا اور وہ ایک بچے کی ماں بن گئی۔ بچے کی پیدائش کی خبر سن کر اس کا شوہر گھر آیا۔ بچے اور بیوی سے مل کر وہ بہت خوش تھا مگر اس کی جیٹھانیوں نے اس کے شوہر کے کان بھرنے شروع کر دیئے۔ انسان تو انسان ہی ہے، وہ دوسروں کے بہکانے سے بہک جاتا ہے۔ اس کے شوہر کے رنگ ڈھنگ بھی بدل گئے اور جتنے دن وہ گاؤں میں رہا بیوی کو جلی

کٹی سناتا رہا۔ مگر وہ اللہ کی بندی کان لپیٹ کر سب کچھ سنتی رہی اور برداشت کرتی رہی۔

کچھ دنوں بعد اس کا شوہر واپس کلکتہ چلا گیا۔ اب وہی پرانے شب و روز تھے۔ اس کے کاموں میں بچے کی دیکھ بھال کرنا بھی شامل ہو گیا۔ اب اسے آرام کرنے کا وقت بھی نہیں ملتا۔ رات کو بھی بچے اسے جگائے رکھتا۔ اس پر یہ ستم ہوا کہ وہ پھر سے حاملہ ہو گئی۔ اور وقت مقررہ پر دوسرے بچے کی ماں بن گئی۔

اب کی بار اس کا شوہر واپس آیا تو پھر لوٹ کر گیا ہی نہیں۔ کلکتہ میں کام تو ملتا تھا مگر گھر کا آرام نہیں۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب گاؤں میں ہی رہ کر کھیتی باڑی کرے گا۔ اس کر گھر آ جانے سے اس کی بھابھیوں کو ایک سنہرا موقع ہاتھ آ گیا اور وہ جیسے ہی شام کو گھر لوٹتا اس کی بھابھیاں اس کے کانوں میں زہر انڈیلنے لگتیں۔ یہ سب باتیں سن سن کر اسے اپنی بیوی پر غصہ آتا۔ وہ اس سے لڑتا جھگڑتا اور بیوی پر ہاتھ بھی اُٹھا دیتا۔ اب تو یہ حالت ہو گئی تھی کہ جب تک وہ اسے مار نہ لیتا اس کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ اس کی جیٹھانیاں اسے جھوٹ موٹ روکنے کی کوشش کرتیں مگر اندر ہی اندر یہ سب دیکھ دیکھ کر خوش ہوتیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ویسے ویسے اس کے شوہر کا غصہ بھی بڑھتا گیا۔ جیٹھانیاں آگ پر پیٹرول کا کام کرتیں۔ وہ روز روز کی مار سے تنگ آ چکی تھی۔ اب دھیرے دھیرے اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا تھا کہ ایسی زندگی سے تو موت اچھی اور اس نے زندگی کو ختم کرنے کے طریقوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔

ایک دن وہ صبح سے ہی اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ گاؤں میں مٹی کے چولہے پر کھانا پکتا ہے۔ وہ بھی لکڑی اور اُپلے کی مدد سے کھانا بنا رہی تھی۔ ایک طرف چاول دوسری طرف سبزی۔ ابھی کھانا تیار ہونے میں وقت تھا۔ اس کا شوہر جب باہر سے آیا تو آتے ہی کھانا مانگنے

لگا۔اس نے کہا کہ ابھی تو پک رہا ہے۔ پھر کیا تھا لے دنا دن، دے دنا دن شروع ہو گیا۔آج تو اس نے حد ہی پار کر دی۔ اسے لگا کہ اب فیصلے کی گھڑی آ گئی ہے۔اب زندہ رہنا بیکار ہے۔ اب اور نہیں جینا۔ایسی زندگی کا کیا کرنا۔غصے سے اس کا سارا بدن کانپ اُٹھا۔غصّہ میں انسان شیطان بن جاتا ہے۔ اس اپنے آپ کو ختم کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔اس پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اُٹھی اور اُبلتے چاول کے پتیلی کو اپنے سر سے انڈیل لیا۔ پورے جسم کی کھال اُتر گئی۔ جب اس کے پورے جسم میں جلن ہونے لگی تو وہ بے چینی میں کھیتوں کی طرف بھاگی۔اسے اس طرح بھاگتے دیکھ کر بہت سارے لوگ بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ وہ گرتی پڑتی پانی سے بھرے ایک گڈھے میں جا گری۔ وہ بری طرح تڑپ رہی تھی لیکن موت نے اسے اپنی آغوش میں نہیں لیا تھا۔ وہ بچ گئی تھی۔لوگوں نے اسے پکڑ کر اُٹھایا اور علاج کروانے کے لیے ہسپتال لے کر گئے۔اسے جب ہوش آیا تو یہ سوچ کر بہت روئی کہ موت نے بھی اسے گلے لگانے سے انکار کر دیا تھا۔اب پھر وہی گھر ہوگا اور وہی مار پیٹ کا سلسلہ۔لیکن جب وہ مرہم پٹّی کروا کے گھر پہنچی تو اسے ایک عجیب طرح کا احساس ہوا۔اس کی جیٹھانیاں اسے سہمی سہمی نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور اس کے شوہر کی نگاہوں سے شرمندگی جھلک رہی تھی۔

اب سب کچھ بدل چکا تھا۔ جیٹھانیوں کی قینچی کی طرح چلنے والی زبانیں خاموش تھیں اور اس کا شوہر بجائے مارنے پیٹنے کے اس کا خیال رکھنے لگا تھا۔اب اس کے دل میں جینے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی اور اسے ایسا لگا جیسے وہ سچ مچ کی شہزادی بن گئی ہے۔

◀◀ ● ▶▶

اسٹیٹس

پچھلے کئی دنوں سے سردی کافی بڑھ گئی تھی۔لیکن مُنیا حسب معمول آٹھ بجے امتیاز صاحب کے گھر کام کرنے پہنچ گئی تھی۔ٹھنڈ کی وجہ اسکولوں میں چھٹی ہو گئی تھی۔لہٰذا دونوں بچے عاطف اور آصف ابھی تک خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔امتیاز صاحب شیو کر رہے تھے اور میم صاحب اپنے کپڑوں کی الماری کھول کر اپنے لیے کوئی اچھا سا لباس منتخب کر رہی تھیں۔وہ نہایت خوش پوش تھیں۔ ہر تقریب کے لیے ان کے پاس الگ الگ کپڑے تھے۔اور وہ ایک کپڑا زیادہ دنوں تک نہیں پہنتی تھیں۔اور اپنے اُتارے ہوئے کپڑے مُنیا کو دے دیا کرتی تھیں۔وہ اسے تنخواہ کے علاوہ بھی پیسے دیتی رہتی تھیں۔گھر میں روز ہی کوئی نہ کوئی اسپیشل ڈش بنتی رہتی تھی۔ان سب میں مُنیا کا برابر کا حصہ ہوتا۔میم صاحب اگر کسی فنکشن میں جاتیں تو کبھی کبھی اسے بھی ساتھ لے کر جاتیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے یہاں کئی برسوں سے لگاتار کام کر رہی تھی جبکہ دوسرے گھروں کی نوکرانیاں سال چھ مہینے ہی میں گھر بدل لیا کرتی تھیں۔

امتیاز صاحب سرکاری افسر تھے اور دودھ کے ساتھ بالائی کے بھی شوقین تھے۔اس لیے میم صاحب کو اپنے شوق پورے کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ منیا نے میم صاحب کو سلام کیا اور اپنے کام میں لگ گئی۔بیگم صاحبہ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور کہا کہ صاحب کو چائے بنا کر دے دے۔اس نے کچن کا رخ کیا اور تھوڑی ہی دیر میں چائے صاحب کو دے آئی۔صاحب نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی اور چائے کی پیالی اٹھالی۔اس کے بعد منیا برتن دھونے میں لگ گئی۔کام کرنے والیوں کی آنکھیں اور کان ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ وہ

کام کرنے کے دوران پورے گھر کا جائزہ بھی لیتی رہتی ہیں اور پھر ایک گھر کی بات دوسرے گھر اور دوسرے گھر کی بات تیسرے گھر میں پہنچاتی رہتی ہیں۔ برتن دھونے کے بعد جب منیا جھاڑو دے رہی تھی تو اس کے کانوں میں بیگم صاحب کے موبائل بجنے کی آواز آئی۔اس کا دھیان اس طرف چلا گیا۔بیگم صاحب نے فون اُٹھایا اور پھر کسی سے گفتگو کرنے لگیں۔فون کا اسپیکر آن تھا اس لیے ساری باتیں منیا بھی سن رہی تھی۔وہ کہہ رہی تھیں۔

''اچھا یہ بتاؤ تم کیا پہن رہی ہو ؟''''ادھر سے میم صاحب کی باجی کی آواز آئی۔

''شکر ہے ابھی کل ہی میں نے مال سے ایک ساری خریدی ہے۔میں تو وہی پہنوں گی۔''

''ہاں تو اور کیا اتنے لوگوں میں اچھا نظر آنے کے لیے یہ سب تو کرنا ہی پڑے گا۔''

ذرا اپنے اسٹیٹس کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ایسے بھی میری بہن کی نندیں اور جیٹھانی کی بیٹیاں میرے اسٹائل کی فین ہیں۔''میم صاب نے قہقہہ لگاتے ہوئے اپنی بات کہی۔

''اچھا چلو ٹھیک ہے پھر وہیں ملتے ہیں۔''میم صاحب نے بات ختم کی اور منیا سے مخاطب ہو کر بولیں۔

''جلدی کام ختم کرو۔صاحب کے آفس جانے کے بعد ایک جگہ جانا ہے۔تم گھر میں رہنا۔

نو بج چکے تھے۔میم صاحب نے بچوں کو زبردستی اُٹھایا اور انہیں برش کرنے کے لیے بھیجا۔دونوں بچے اس طرح اُٹھائے جانے پر طرح طرح کے منھ بنا رہے تھے لیکن امتیاز صاحب کے ڈر سے کچھ بول نہیں پا رہے تھے۔منیا جھاڑو برتن کرنے کے بعد کچن کا کام کرنے لگی۔اس کا ذہن اُلجھ رہا تھا۔فنکشن وغیرہ تو عموماً رات کے وقت ہوتا ہے۔یہ میم صاحب دن کے وقت اتنا بن سنور کر کہاں جا رہی ہیں؟اس نے سوچا۔پھر اسے خیال آیا کہ آجکل بہت سی شادیاں دن کے وقت بھی انجام پاتی ہیں۔ہوسکتا ہے کہ وہ ایسی ہی کسی تقریب میں جا رہی

ہوں۔خیر اسے کیا۔اسے تو اپنے کام سے مطلب رکھنا چاہیے۔

اس نے پھرتی کے ساتھ ناشتہ تیار کیا۔امتیاز صاحب آفس جانے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔بچے بھی ٹیبل پر آ کر بیٹھ چکے تھے۔اس نے ناشتہ لگا دیا اور میم صاحب کو بلانے ان کے کمرے میں گئی۔اس نے دیکھا کہ میم صاحب ابھی تک کپڑوں میں اُلجھی ہوئی تھیں۔شاید مال والی ساری پہننے کا خیال ترک کر دیا تھا۔اس نے جب میم صاحب کو ناشتے کے لیے کہا تو وہ کہنے لگیں۔

''صاحب اور بچوں کو کھلا دو۔میں بعد میں کھاؤں گی۔''

''جی میم صاحب!''اتنا کہہ کر وہ مُڑی اور صاحب اور بچوں کو ناشتہ سرو کرنے لگی۔

دس بجے صاحب آفس کے لیے روانہ ہو گئے۔بچے موبائل میں گیم کھیلنے لگے۔میم صاحب نے منیا کو آواز دی۔وہ ان کے پاس آئی تو کہنے لگیں۔

''اچھا اب میں ناشتہ کرنے جا رہی ہوں۔میں نے اپنے کپڑے نکال کر رکھ دیئے ہیں۔تم جلدی سے ان میں آئرن کر دو۔اور میری وہ سینڈل بھی نکال دو جو میں دبئی سے لے کر آئی تھی۔وہ ساری سے میچ کر رہی ہے۔''

''جی میم صاحب!ابھی کرتی ہوں۔''منیا کپڑے آئرن کرنے گئی تو اس نے دیکھا کہ میم صاحب نے کوئی دوسری ساری نکال رکھی تھی۔لگتا ہے میم صاحب کسی خاص جگہ جا رہی ہیں تب ہی تو اتنی تیاریاں ہو رہی ہیں۔اس نے دل ہی دل میں سوچا اور اپنے کام میں لگ گئی۔

میم صاحب ناشتہ سے فارغ ہو کر کپڑے تبدیل کرنے لگیں۔وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلیں تو منیا نے رشک بھری نظروں سے دیکھا۔شیفون کی کھلتے رنگ کی ساری، بے داغ شفاف چہرے پر نیچرل میک اپ اور ہیروں کے ہار میں وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔انہوں نے منیا سے کہا۔

''اچھا اب میں چلتی ہوں۔ دن کا کھانا بنا کر رکھنا اور بچوں کا خیال رکھنا۔ گھر سے باہر جانے نہ پائیں۔''

''جی میم صاحب!'' منیا اس بات پر حیرت زدہ تھی کہ آخر میم صاحب اتنا بن سنور کر کہاں جا رہی ہیں کہ نہ صاحب ساتھ جا رہے ہیں اور نہ بچے۔ آخر اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

''میم صاحب! آپ کسی خاص فنکشن میں جا رہی ہیں کیا؟''

''ارے نہیں! میری چھوٹی بہن ہے نہ آمنہ، اس کے سسر فوت ہو گئے ہیں۔ وہیں جا رہی ہوں۔'' انہوں نے موبائل فون بیگ میں رکھتے ہوئے کہا اور باہر نکل گئیں۔

◀◀ ● ▶▶

واپسی

نہ جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا کہ ہر طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کی آنکھ کھل گئی مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ شور کیسا ہے۔ پھر اس کے کانوں میں میں یہ آواز آئی کہ باندھ ٹوٹ گیا ہے۔ وہ تیزی کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی بیوی اور بچے بھی بیدار ہو گئے تھے اور اب وہ سب مل کر چیخ چلا رہے تھے۔ وہ دوڑتے ہوئے اپنے کھیتوں پر پہنچا۔ وہاں ہر طرف پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا۔ ساری فصل ڈوب کر برباد ہو گئی تھی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور اپنی بے بسی، بے کسی اور لاچاری پر آنسو بہانے لگا۔ اب کیا ہو گا؟ گزر بسر کیسے ہو گی؟ بینک سے قرضہ لے کر بیج اور کھاد خریدا تھا۔ فصل لہلہانے لگی تھی تو اسے امید بندھی تھی کہ بینک کا قرضہ چکانے کے بعد بھی اتنی رقم بچ جائے گی کہ سارا سال آرام سے گزرے گا۔ مگر اس کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ گاؤں میں زیادہ تر لوگ غریب ہی تھے لہذا کہیں سے کوئی قرض یا مدد ملنے کی بھی امید نہیں تھی۔ بڑی مشکل گھڑی تھی۔ اس کی بیوی بھی مسلسل روئے جا رہی تھی۔ بچے الگ پریشان تھے۔ خیر کسی طرح رات کٹی اور صبح کا اجالا پھیلا۔ ہر طرف تباہی و بربادی کا منظر تھا۔ کھیت تو ڈوبے ہی تھے کئی گھروں میں بھی پانی گھس آیا تھا۔ ایسے وقت میں سبھی ایک دوسرے کی مدد کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ سرکاری مدد بھی آئی۔ پھر دھیرے دھیرے حالات معمول پر آنے لگے۔ لوگ اپنے روز مرّہ کے کاموں میں لگ گئے۔ اس نے بھی چاہا کہ پھر سے زندگی کو واپس پٹری پر لایا جائے لیکن اب کھیتی باڑی سے اس

کا دل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ بہت سوچ وچار کے بعد اسے ایک راستہ سوجھا، کیوں نہ شہر جا کر محنت مزدوری کی جائے۔ اس کے گاؤں کے بہت سارے لوگ پہلے ہی سے بڑے شہروں میں کام کیا کرتے تھے اور اچھے پیسے کماتے تھے۔ اس نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور پھر ایک روز وہ اللہ کا نام لے کر شہر کے لیے روانہ ہو گیا۔ کہا گیا ہے کہ سفر وسیلۂ ظفر ہے۔ چنانچہ شہر پہنچ کر وہ کام کی تلاش میں لگ گیا اور بہت جلد اسے کام بھی مل گیا۔ آمدنی بھی اچھی ہونے لگی تھی۔ اپنا خرچ پورا کرنے کے بعد وہ باقی رقم گھر بھیج دیا کرتا تھا۔ شہر میں کام کرتے کرتے اسے خیال آتا کہ کھیتی کرنا بھی کتنا مشکل کام ہے۔ سال بھر جی توڑ محنت کرنے کے بعد بھی پریشانی لگی رہتی تھی۔ کھیت میں بوائی کرنے کے بعد اس کی دیکھ بھال کرنا، رات رات بھر پہرا دینا، جانوروں اور دنگوں سے کھیت کی حفاظت کرنا اس پر سے کبھی سیلاب، کبھی سُکھاڑ اور کبھی کوئی اور وجہ۔ وہ سوچتا کہ اچھا ہی ہوا کہ وہ شہر آ گیا اور کام دھندے سے لگ گیا۔ دن بھر محنت کرو اور شام کو مزدوری لے جاؤ۔ نہ کوئی فکر نہ کوئی غم۔

مزدوری کرتے کرتے اسے کام کا کافی تجربہ ہو گیا تھا۔ ایک دن اس کی ملاقات کسی فیکٹری کے مالک سے سے ہو گئی اور پھر اسے فیکٹری میں ملازمت مل گئی۔ اب اسے کام کم کرنا پڑتا تھا اور ماہانہ تنخواہ ملنے لگی تھی جبکہ مزدوری میں یہ ہوتا تھا کہ کبھی کام ملا اور کبھی کام نہیں ملا۔

وہ ہر ماہ ایک بار اپنے گھر کا چکر لگاتا۔ اس کے گھر کی حالت سدھر رہی تھی۔ بیوی بچوں کی صحت بھی اچھی رہنے لگی تھی۔ بچے گاؤں کے اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ گاؤں والے بھی اس کی تعریف کرتے اور کہتے کہ اس نے بہت اچھا فیصلہ کیا کہ شہر چلا گیا ورنہ گاؤں میں رکھا ہی کیا ہے؟

وقت گزرتا گیا۔ اس کی بیوی بھی سگھڑ اور ہوشیار تھی۔ اس نے پیسے بچا بچا کر اپنے

کچے اور ٹوٹے پھوٹے مکان کو دھیرے دھیرے پختہ کرانا شروع کر دیا۔ لیکن وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ زندگی راستے پر آئی تو اس نے نئے نئے خواب بھی دیکھنے شروع کر دیئے۔ اب تک وہ کرائے کی ایک جھونپڑی میں تنہا رہتا آیا تھا لیکن جلد ہی وہ دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان لے کر اپنے گھر والوں کو شہر لانا چاہتا تھا تاکہ وہ سب ایک ساتھ رہیں اور اس کے بچے شہر کے اسکول میں پڑھ سکیں۔

ابھی وہ مستقبل کے تانے بانے بُن ہی رہا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ چین میں کوئی نئی وبا آئی ہے جس سے لوگ دھڑا دھڑ مر رہے ہیں۔ اور پھر سننے میں آیا کہ اب دوسرے ممالک بھی اس کی چپیٹ میں آتے جا رہے ہیں۔ لیکن اپنے ملک میں ایسی کوئی خبر نہیں تھی اور سب کچھ حسب معمول چل رہا تھا۔ لیکن یہ اطمینان زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ یہاں بھی اس خطرناک وائرس نے دستک دی اور فضاء میں ایک انجانا سا خوف پھیل گیا۔ ہر شخص سہما سہما سا دکھائی دینے لگا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے اندیشے جنم لینے لگے۔ اس نے اپنے آس پاس نظریں دوڑائیں۔ سب کچھ حسب معمول تھا۔ زندگی رواں دواں تھی اور سارے کام اپنے مقررہ وقت پر انجام پا رہے تھے۔ پھر ایک دن اس نے سنا کہ پردھان منتری آج رات آٹھ بجے قوم کے نام کوئی پیغام نشر کرنے والے ہیں۔ اور پھر جب رات آٹھ بجے یہ اعلان ہوا کہ ملک بھر میں اکیس دنوں کے لیے لاک ڈاؤن کر دیا گیا ہے۔ آنے جانے والی سبھی سواریوں کو روک دیا گیا ہے اور یہ حکم نافذ ہوا ہے کہ جو جہاں ہے وہیں رہے گا تو سبھوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ ادھر سارے کام دھندے بند ہو گئے۔ فیکٹریوں میں تالے لگ گئے۔ مشینوں کی آوازیں بند ہو گئیں اور مزدور لوگ اپنے اپنے گھروں کی جانب پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ اس نے بھی اپنا مختصر سا سامان اُٹھایا اور پیدل چلنے والوں کے قافلے میں شامل ہو گیا۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا گھر یہاں سے کتنے میل کے فاصلے پر ہے اور وہاں تک پہنچنے میں اسے کتنے دن لگیں گے۔ مگر ابھی یہ سب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ وہ تو بس ایک بھیڑ کا حصہ تھا۔ اس سفر میں ان بے یار و مددگار لوگوں کو طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بھوکے پیاسے پیدل چلنے والوں کو پولس والوں نے کہیں ڈنڈے مارے تو کہیں مرغا بنایا اور کہیں جانوروں کی طرح گھٹنوں کے بل چلنے پر مجبور کیا گیا۔ راستے میں بھوک پیاس اور تھکن سے نڈھال ہو کر لقمۂ اجل بھی بن گئے۔ مگر جو سخت جان تھے وہ چلتے رہے۔ وہ بھی کسی طرح تین دن اور تین رات کی مسافت کے بعد اپنے گاؤں پہنچا۔ گھر جانے سے پہلے راستے میں اسے اپنے کھیت ملے جو ویران پڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور پھر اپنے کھیت کی ایک مٹھی مٹّی کو ہاتھوں سے اُٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگایا اور روتے ہوئے بولا۔

''اب میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا۔ کبھی نہیں۔''

◀◀ ● ▶▶

نئی روشنی

انسان بھی کیا شے ہے۔ ذرا سی بات پہ گھبرانا، پریشان ہونا اس کی فطرت میں شامل ہے جب آدمی حالات سے لڑتے لڑتے تھک جاتا ہے تو وہ کوئی ایسا راستہ ڈھونڈنے لگتا ہے جس سے اسے سکون مل جائے، زندگی میں راحت مل جائے۔

نفیسہ بے چاری بھی روز روز کی چک چک سے تھک چکی تھی۔ طعنہ اور بھپتیاں سننا تو اس کی زندگی کا مقدر بن گیا تھا۔ وہ ایسی باتیں سننا نہیں چاہتی تھی مگر اس کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہوتا وہی ہے جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ یہ ساری باتیں برداشت کر لیتی تھی۔ لیکن آخر کب تک؟ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اور یہ حد اس وقت پار ہوگئی جب اس کے شوہر نے اس سے منھ پھیر لیا اور دن رات جلی کٹی سنانے لگا۔ وہ شوہر جس کے لیے وہ اپنے گھر سے رخصت ہو کر سسرال آئی۔ ایک لڑکی کو سب سے زیادہ لگاؤ اپنے میکے سے ہوتا ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن، سکھی سہیلیاں، گھر کا آنگن، دالان، کمرے..... یہ ساری چیزیں اس کے لاشعور میں رچ بس جاتی ہیں۔ اور جب وہ کسی اجنبی کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اس کا جسم تو کہیں اور جا رہا ہے مگر اس کی روح وہیں رہ گئی ہے۔

اس کی شادی ایک معزز گھرانے میں ہوئی تھی۔ مال و دولت ان کے گھر کی باندی تھی۔ حسن و خوبصورتی میں بھی وہ لوگ یکتا تھے۔ ایسے ماحول میں بھلا ایک معمولی شکل و

صورت والی مڈل کلاس کی لڑکی کیسے وہاں کے لوگوں کو پسند آ سکتی تھی۔ یہ تو کاشف کی ضد تھی جس کے آگے اس کے والدین نے سپر ڈال دیا تھا۔ نفیسہ اس کی کلاس فیلو تھی۔ تھی تو وہ ایک عام سی لڑکی مگر اپنے نام ہی طرح نفیس تھی۔ اس کا رکھ رکھاؤ، ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرنے کا انداز اور سب سے زیادہ اس کی شرم گیں آنکھیں کاشف کو پسند آ گئیں۔ پانچ بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹے تھے لہٰذا سب کے لاڈلے تھے۔ بڑے بھائیوں کی شادی ہم رتبہ خاندان میں ہوئی تھی۔ چاروں بہوئیں نہایت حسین و جمیل تھیں۔ ساس محترمہ بھی اپنے وقت کی پری رہی ہوں گی۔ اب بھی بہت ٹھسّے میں رہا کرتی تھیں۔ پورے گھر کی مالکن تھیں۔ پورا گھر ان کے اشارے پر چلتا تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کی کسی بات پر اُف بھی کرے۔ پانچوں بیٹے بھی ماں کے مرید تھے اور شوہر بے چارے تو غلام تھے۔

نفیسہ جب اس گھر میں آئی تو پہلے پہل اسے یہ سب کچھ عجیب سا لگا کیونکہ اس کے میکے کا ماحول یہاں سے بالکل مختلف تھا۔ لیکن عورت کی فطرت پانی کی طرح ہوتی ہے۔ پانی جس برتن میں جاتا ہے اسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ نفیسہ نے بھی اپنے آپ کو وہاں کے مزاج کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیا لیکن جب اسے میکے کا طعنہ سننا پڑتا یا کوئی اس کی شکل وصورت پر کوئی طنزیہ جملہ کہتا تو اس کے دل پر ایک ٹھیس سی لگتی مگر اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ کاشف اس کا اپنا ہے۔ اس کی باتوں کو دھیان سے سنتا ہے۔ اس کے زخموں پر مرہم رکھتا ہے۔ اس کی تکلیفوں کو کم کرتا ہے لیکن اب وہ بھی دھیرے دھیرے بدل رہا تھا۔ اس کی بھابھیاں اور ماں دن رات اس کے خلاف کاشف کے کان بھرتی رہتیں۔ آدمی آدمی ہی ہے۔ جس طرح وہ شیطان کے بہکاوے میں آجاتا ہے اسی طرح انسان کے بہکاوے میں بھی آجاتا ہے۔ کاشف بھی بہک گیا۔ دن بھر تو وہ گھر والوں کی تضحیک برداشت کرتی ہی تھی۔ اب رات کو کاشف بھی

اسے اپنی تنقید کا نشانہ بنانے لگا۔ اور ایک روز جب اس نے اسے مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا تو اس کے دل نے کہا کہ بس بہت ہو چکا۔ اب اور برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ لیکن وہ بھی تو کیا کرے؟ کیا میکے لوٹ جائے؟ نہیں یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ کیا خودکشی کر لے؟ نہیں، یہ بزدلی ہے۔

تو پھر.....؟

تو پھر وہ کیا کرے؟

کیا کرے؟

وہ سوچتی رہی۔ رات بھر سوچتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ یہاں تک کے پو پھٹ گئی۔ صبح کی سپیدی نمودار ہوئی اور جب سورج کی پہلی کرن اس کی پلکوں سے ٹکرائی اور ایک نیا خیال اس کے ذہن میں کوند گیا۔ اس نے سوچا کہ جس طرح روشنی کی یہ کرن اندھیرے کا مقابلہ کر رہی ہے اسے بھی اسی طرح زندگی میں در آئی تاریکی کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

اسے اپنے جسم و جاں میں ایک نئی طاقت دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ بستر چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

◂◂ ● ▸▸

سہیلی

موبائل بھی کیا چیز ہے۔اس نے ساری دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ویسا ہی گاؤں جیسا میرے بچپن میں ہوا کرتا تھا۔ ہر شخص ایک دوسرے کو جانتا اور پہچانتا تھا۔صبح شام دعا سلام ہوتی تھی۔ایک دوسرے سے دل کی باتیں کی جاتی تھیں۔غم اور خوشی آپس میں شیئر کیے جاتے تھے۔پھر دیکھتے ہی دیکھتے وقت کا پنچھی اُڑتا چلا گیا اور زمانے نے ایسی اُڑان بھری کہ کوئی کہاں کوئی کہاں پہنچ گیا۔ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ یادیں دھندلی ہو گئیں۔شکلیں انجانی ہوگئیں اور آنکھوں پر غیریت کے پردے پڑ گئے۔

پھر زمانے نے کروٹ لی اور سائنس کے معجزوں میں ایک اور اضافہ ہوا۔موبائل نے بچھڑے ہوؤں کو ملا دیا۔دلوں کی دوریاں ختم ہوگئیں۔اور وقت کی گرد تیز ہواؤں میں اُڑ گئی اور پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔

ایک روز ایک اجنبی نمبر کے کال نے مجھے چونکا دیا۔

''السلامُ علیکم!'' ادھر سے ایک کچھ جانی کچھ انجانی سی آواز سنائی دی۔میں نے سلام کا جواب دیا۔ادھر سے پھر آواز آئی۔

''پہچانا؟'' میں گومگو کا شکار ہوگئی۔آواز کچھ کچھ پہچانی سی ضرور تھی لیکن آواز والی کا چہرہ ذہن میں اُبھر نہیں پا رہا تھا۔لاکھ کوششوں کے باوجود میں اس آواز کو نہ پہچان پائی۔میں نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں تمہیں نہیں پہچان پا رہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ادھر سے پھر آواز آئی۔

''ذہن پر زور دو۔پہچانو کہ میں کون ہوں۔''

میں نے ہتھیار ڈال دیے اور پھر ایک بار کہا کہ افسوس میں نہیں پہچان پا رہی ہوں۔ تب اس نے بتایا میں تمہاری پھول اور تم میری پان ہو۔اتنا سن کر میں فوراً ہی اسے پہچان گئی اور اپنے بچپن کی یادوں میں کھو گئی۔کیا وقت تھا وہ۔بچپن بھی کتنا سہانا ہوتا ہے۔ہر غم و فکر سے انجانا ہوتا ہے۔آزاد زندگی.....صرف پڑھنا اور کھیلنا۔شاذیہ میری گہری سہیلی تھی۔وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔لمبی چوڑی اور تندرست۔ وہ عمر میں مجھ سے بہت بڑی بھی تھی لیکن ہماری آپس میں دوستی ہوگئی۔ہم دونوں ساتھ اسکول جاتیں اور آتیں۔کبھی وہ مجھے لینے آتی کبھی میں اسے لینے جاتی۔

ایک دن میں شاذیہ کے گھر گئی تو وہ کہنے لگی کہ آج میں اسکول نہیں جاؤں گی،تم بھی مت جاؤ۔پھر ہم دونوں کھیلنے لگے۔اس وقت ایک گڑیا ہوتی تھی۔اسکی شادی ہوتی تھی اور پھر چھوٹے چھوٹے مٹی کے برتن ہوتے تھے اس میں کھیر پکانا،کھد بد یا پکانا اس طرح کے کھیل تھے۔پھر ہم لوگ روز اسکول ناغہ کرنے لگے۔کھیلتے کھیلتے وقت کیسے نکل جاتا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔جیسے ٹائم ہوتا تو میں گھر میں حاضر ہو جاتی لیکن یہ چوری زیادہ دنوں تک نہیں چلی اور میں پکڑی گئی۔ایک دن پھوپھی زاد بہن نے گھر میں یہ بتا دیا کہ ایمن تو آجکل اسکول ہی نہیں جاتی ہے۔گھر میں کافی ڈانٹ پڑی۔اس کے بعد میں نے ایسی غلطی نہیں کی۔کیونکہ امّی کی نظر کڑی ہوگئی تھی۔اب پہرے بھی لگ گئے تھے اس لئے صرف چھٹی کے وقت ہم لوگ کھیلتے تھے۔کبھی کھیلنے کے لیے وہ میرے یہاں آجاتی کبھی میں اس کے یہاں چلی جاتی۔شاذیہ کے گھر میں بانس پھٹی سے بنا ایک مٹ کوٹھا تھا جو ہلتا بھی تھا۔اسی پر ہم دونوں گھنٹوں کھیلتے تھے۔کوئی پرب آتا تو سینی میں سجا کر ہر چیز ایک دوسرے کے گھر بھیجی جاتی۔عید آتی تو ایک سینی میں سوئی، زردہ، لچھا دودھ اور وہ سارے میٹھے نمکین آئٹم جو گھر میں بنے ہوں اور دوسری سینی

میں کپڑے چوڑی چپل سنگار کا بہت سارا سامان عیدی پر بھیجی جاتی۔ دونوں کی ماں اور پورے خاندان کی اس میں دلچسپی ہوتی تھی۔ سبھی لوگ خوش ہوتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے دعوت پارٹی ہوتی رہتی تھی۔ گھر میں کسی کی شادی ہوتی تو کپڑے بنتے۔ اچھا وقت تھا، یادگار لمحے، جنہیں بھولنا بھی چاہو تو بھلا نہ پاؤ۔

ایک روز میں اسکول جانے کے لئے نکلی تو سوچا کہ شاذیہ کو بھی ساتھ لے لوں۔ لیکن جب میں اس کے گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ اس کی امی آنگن میں گر گئی تھیں۔ انہیں بہت چوٹ آئی تھی۔ لہذا وہ میرے ساتھ اسکول نہیں جا سکی۔ ایک روز میرے ابی نے مجھے ڈرا دیا۔ کہنے لگے کہ تم شاذیہ کے گھر نہ جایا کرو۔ وہاں جن ماموں رہتے ہیں۔ دیکھو جن ماموں نے شاذیہ کی امی کو پٹک دیا۔ ان کا ہاتھ ٹوٹ گیا ہے۔

اب میں زیادہ تر گھر میں رہنے لگی تھی۔ اسکول بہت کم جاتی تھی۔ کھیلنے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ مجھے اب اس کا گھر سچ میں جناتوں کا گھر لگنے لگا تھا۔ میں ڈرنے لگی کہ کیا سچ میں جن ماموں ہوتے ہیں اور انہوں نے ہی شاذیہ کی امی کو چوٹ پہنچائی ہے۔ ابی نے صحیح بتایا ہے؟ شاذیہ سے میری دوری بڑھ گئی تھی۔ میں اسے دیکھتی تو ڈر جاتی۔ وہ بار بار پوچھتی کہ کیا ہوا، کیوں میرے یہاں آنا جانا چھوڑ دیا؟ لیکن میں اسے کیا بتاتی کہ جہاں تم رہتی ہو وہاں جن ماموں رہتے ہیں اسی لئے اب میں تمہارے یہاں نہیں جاتی۔

پھر میرا ایڈمیشن پٹنہ کے اسکول میں ہو گیا۔ اب میں وہیں اپنے چچا کے گھر میں رہتی اور پڑھائی کرتی۔ چھٹیوں میں کچھ دنوں کے لئے اپنے گھر آتی تو بھی شاذیہ سے ملنے نہ جاتی۔ اس کے گھر کے آس پڑوس سے بھی ڈر ہو گیا تھا۔ امی نے بہت سمجھایا تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہے جن ماموں انسانوں کے بیچ نہیں ہوتے ہیں۔ شاذیہ کی امی تمہاری ابی کی بھابھی لگتی ہیں اسی لئے

مذاق کیا تھا۔ لیکن میں ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اب دونوں کی زندگی الگ تھی، بس یادیں ہی ساتھ تھیں۔ پھر شاذیہ کی شادی ایک دور دراز کے شہر میں ہو گئی۔ میری بھی شادی ہو گئی اور پھر ہم دونوں یوں بچھڑے کہ کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔

کتنے ہی برس بیت گئے۔ زندگی کا زیادہ تر حصہ گزر چکا تھا۔ سبھی اپنی زندگی میں آگے بڑھ چکے تھے۔ بچے بڑے ہو گئے تھے اور اپنی اپنی مشغولیات میں لگے تھے۔ بھاگ دوڑ کی زندگی میں کسی کو دوسروں کی خبر لینے کا ہوش ہی کہاں رہتا ہے۔ سب اپنے اپنے مسئلوں میں الجھے ہوئے ہیں۔

لیکن بھلا ہو اس موبائل کا کہ یہ بچھڑوں کو ملانے کا کام کرتا ہے۔ پتہ نہیں اس نے کہاں سے میرا نمبر لیا اور مجھے فون کر دیا۔ جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا کہ پہلے پہل میں اسے نہیں پہچان سکی لیکن جب اس نے اپنے نام بتایا تو بہت ساری بھولی بسری خوبصورت یادیں ذہن کے پردے پر ابھر آئیں اور میرا دل عجیب و غریب ہاں جذبات سے بھر گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''ایمن! کتنے برس بیت گئے۔ تمہیں یاد بھی ہے۔ اچھا سنو، میرے بیٹے کی شادی ہے۔ تم آؤ گی تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ بچپن کی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔ میں اپنے بیٹے کو بتاؤں گی دیکھو یہ میری وہ سہیلی ہے جس کے ساتھ میں نے زندگی کے حسین لمحے گزارے ہیں۔ بولو آؤ گی نا؟'' اس کی آواز میں محبت بھری التجا تھی۔ میں نے کہا ضرور آؤں گی۔ ان شاء اللہ۔'' لیکن افسوس کہ گھر کی ذمہ داریوں میں ایسی الجھی کہ اس کے پاس نہ جا سکی۔ کاش موبائل کے پاس دلوں کو جوڑنے کا بھی کوئی ایپ ہوتا۔

◂◂ ● ▸▸

چٹک مٹک

دن بھر کی اُمس بھری گرمی سے پریشان ہوکر وہ شام کے وقت بالکونی میں بیٹھ جایا کرتی تھی اور نیچے سڑک پر ہورہے شور شرابے میں مگن ہوجاتی۔ کبھی کوئی موٹر سائیکل گزرتی کبھی کوئی کار اور پھر سب سے زیادہ چھوٹے بچوں کا ہنگامہ.....

ایک روز جب وہ حسب معمول اپنی بالکونی میں بیٹھی تھی کہ نیچے چھوٹے بچوں کا زبردست شور سنائی دیا۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ ایک وحشت زدہ سی عورت تیز قدموں سے چلی آرہی تھی۔ اس کے سر کے بال میلے اور اُلجھے الجھے تھے۔ نہایت بوسیدہ اور گندے کپڑوں میں ملبوس اس عورت کی آنکھیں خوف کی شدت سے پھٹی جارہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں دو تین چھوٹے چھوٹے پتھر بھی تھے اور اس کے منہ سے گالیاں نکل رہی تھیں۔

پھر چند ہی لمحوں میں وہ عورت اگلے موڑ سے گزر کر نظروں سے اوجھل ہوگئی اور بچے بھی اس کے پیچھے دوڑتے چلے گئے۔

جب بھی کوئی نیا واقعہ اس کی نگاہوں کے سامنے آتا ہے تو اسے کرید ہوجاتی ہے اور وہ اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتی۔ پھر وہ عورت کئی بار گھر کے سامنے سے گزری.....اسی حالت میں۔ ایک روز اس نے اپنی پڑوسن سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے تفصیل کے ساتھ اس کا قصہ سنایا۔

وہ ایک غریب عورت تھی۔ لوگوں کے گھروں میں کام کیا کرتی۔ شوہر مزدوری کیا کرتا۔ اس کی ایک ہی بیٹی تھی۔ دونوں نے مل کر، کچھ ادھر اُدھر سے مانگ کر ایک مٹی کا جھونپڑا

بنایا تھا۔ اس وقت یہ علاقہ غیر آباد تھا اور زمین کی قیمت نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن پھر دھیرے دھیرے وہاں بستی بسنے لگی۔ آبادی بڑھی تو نئے نئے لوگ وہاں پر مکان بنانے لگے اور زمین کی قیمت بڑھتی چلی گئی۔

ایک روز اس کے شوہر کے سینے میں شدید درد اُٹھا۔ شاید اسے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ چٹ پٹ ہوگیا اور وہ اپنی بیٹی کے ساتھ اکیلی رہ گئی۔

اب اس کی عمر بڑھ چلی تھی۔ گھٹنوں اور کمر میں درد رہنے لگا تھا۔ اس سے کام میں سُستی ہونے لگی تو لوگوں نے اس سے کام کروانا بند کر دیا۔ اب ایک ساتھ دو دو مسئلے منھ پھاڑے کھڑے تھے۔ اول تو اپنا اور بیٹی کا پیٹ پالنا اور دوم بیٹی کی شادی کرنا۔ وہ تو بھلا ہو کشادہ دل لوگوں کا جو مجبوروں کی ہر طرح سے مدد کیا کرتے ہیں۔ اب اس نے بھیک مانگنے کو اپنا مستقل پیشہ بنالیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ لوگوں سے بیٹی کی شادی کے لیے بھی پیسے مانگا کرتی۔

آخر خدا خدا کر کے ایک لڑکا ملا۔ وہ رکشہ چلاتا تھا لیکن شادی پر اس نے ایک شرط رکھی۔ کہنے لگا۔

''ہم تمری بیٹی سے سادی کریں گے لیکن سرط یہ ہے کہ تم ای جھونپڑیا میرے نام لکھ دو۔''

وہ بولی۔

''ارے بیٹا ہم مرجاوینگے۔ میرے پاس جو کچھ بھی ہے سب تم ہی لوگوں کا ہوگا۔ ہم بڑھیا کب دنیا چھوڑ دیں کیا پتہ۔''

جیسے تیسے کر کہ بیٹی کی شادی کا مرحلہ طے پایا اور بیٹی سسرال چلی گئی۔

بیٹی کی شادی کے بعد وہ فری ہوگئی۔ پہلے بھی بھیک مانگتی تھی اور اب بھی بھیک مانگتی تھی۔ اب وہ آرام سے چھوٹی سی گٹھری لے کر نکل جاتی۔ مانگ تانگ کر واپس گھر آتی۔ آرام

سے سوتی۔صبح پھر اپنی ڈیوٹی پر نکل جاتی۔لیکن بڑھاپے کی وجہ سے اب وہ چولہا چوکا کرنے سے معذور تھی۔اب وہ مانگنے جاتی تو کھانے کی فرمائش کرتی۔جس کے یہاں جو پکا ہوتا لوگ دے دیتے تھے۔ظاہر ہے روز دن تو اچھا کھانا سب کے یہاں نہیں بنتا۔وہ روز مانگتی اور اسے روز سادہ ہی کھانا ملتا جیسے چاول، دال، سبزی وغیرہ۔عام طور لوگوں کے گھروں میں دن کے وقت سادہ ہی کھانا بنتا ہے کیونکہ گھر کے مورث مرد تو دن میں آفس یا دکان پر ہوتے ہیں۔سبھی گھروں میں اچھا کھانا رات میں بنتا ہے۔

روز ایک ہی طرح کا سادہ کھانا کھا کھا کر وہ اوب گئی تھی۔وہ لوگوں سے کہتی۔

''یہی کھانا ہے؟ کوئی چٹک مٹک کھانا کھلا دو بیٹی۔'' اسے جواب ملتا۔

''جاؤ جاؤ! اتنا مانگ کے جمع کرتی ہو۔گھر میں بنا کر کھاؤ یہ سب۔اتنے پیسوں کا کیا کروگی جو تم نے مانگ کر جمع کیا ہے۔''

لیکن اس نے مانگنا بند نہ کیا تھا۔وہ خرچہ تو ایک پیسہ نہ کرتی۔نہ جانے وہ پیسوں کو کہاں رکھتی تھی؟ اپنی حالت بھی پھٹیچر جیسا رکھتی۔میلے کچیلے کپڑے پہنتی۔گندی میلی گٹھری لے کر نکل جاتی۔اب کچھ لوگ اسے اچھا کھانا دینے بھی لگے تھے۔اب تو سبھی بڑے بچے چٹک مٹک کہہ کر پکارنے بھی لگے تھے۔وہ چڑھنے لگی تھی۔خوب برا بھلا کہتی لوگوں کو بھی مزہ آنے لگا۔وہ بکتی رہتی لوگ اور چڑھاتے رہتے۔

اور پھر ایک دن آگ کی طرح یہ بات پھیل گئی کہ چٹک مٹک کو اس کی بیٹی داماد نے گھر سے نکال دیا اور اس پر اپنا قبضہ کر لیا ہے۔دراصل اس کی بیٹی اور داماد نے اسے پھسلا بہکا کر اس کے جھونپڑی نما مکان کو اپنے نام لکھوا دیا اور جب رجسٹری ہوگئی تو اسے گھر سے نکال دیا اور اس نے بھیک کے پیسے جو تکیے میں چھپا کر رکھے تھے اسے بھی چھین لیا۔

اسی صدمے سے وہ پاگل ہوگئی ہے اور ادھر ادھر ماری پھرتی ہے اور لوگوں سے کہتی ہے۔

''کچھ چٹک مٹک کھلا دو بابو!''

◀◀ ● ▶▶